اِصلاحی مواعِظ

ایسے عام فہم موضُوعات جو ہر شخص
کی اِصلاح کے لیے انتہائی مُفید ہیں

جلد سوم

- بسم اللہ کی اہمیت
- اللہ کا شکر
- استخارہ کا مسنون طریقہ
- توکل کی حقیقت
- اللہ کے لیے جینا مرنا
- توبہ اور اسکی شرائط
- اسلام اور عقل
- ختمِ بخاری شریف
- بدعت ایک گمراہی
- امت مسلمہ کی معیشت

جسٹس مولانا مفتی مُحمّد تقی عُثمانی مدظلہم

بیتُ العُلوم
۲۰- نابھہ روڈ، پُرانی انارکلی لاہور- فون: ۷۳۵۲۴۸۳

اِصلاحی مواعِظ

جلد سوم

اِصلاحی مواعِظ

ایسے عام فہم موضوعات جو ہر شخص
کی اِصلاح کے لیے انتہائی مُفید ہیں

جلد سوم

جسٹس مولانا مفتی محمّد تقی عُثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمّد ناظم اشرف
فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی

بیتُ العلوم

۲۰۔ نابھہ روڈ، پُرانی انارکلی لاہور۔ فون: ۳۵۲۴۸۳۷

کتاب	=	اصلاحی مواعظ
مواعظ	=	جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ
ضبط وترتیب	=	محمد ناظم اشرف (فاضل جامعہ دار العلوم کراچی)
جلد	=	سوم
باہتمام	=	محمد ناظم اشرف
کمپوزنگ	=	گلزار کمپیوٹر سنٹر، محافظ پلازہ، نیو انارکلی لاہور
ناشر	=	بیت العلوم۔ ۲۰ نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی، لاہور فون: ۷۳۵۲۴۸۳

﴿ملنے کے پتے﴾

بیت العلوم	=	۲۰ نابھہ روڈ، پرانی انارکلی، لاہور
ادارہ اسلامیات	=	۱۹۰ انارکلی، لاہور
ادارہ اسلامیات	=	موہن روڈ چوک اردو بازار، کراچی
دار الاشاعت	=	اردو بازار کراچی نمبر۱
بیت القرآن	=	اردو بازار کراچی نمبر۱
ادارۃ القرآن	=	چوک لسبیلہ گارڈن ایسٹ کراچی
ادارۃ المعارف	=	ڈاک خانہ دار العلوم کورنگی کراچی نمبر۱۴
مکتبہ دار العلوم	=	جامعہ دار العلوم کورنگی کراچی نمبر۱۴

پیش لفظ

شیخ الاسلام جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی امابعد!

احقر کے جو بیانات یا تقریریں مختلف مواقع پر ہوتی رہی ہیں، بعض دوستوں نے انہیں قلمبند کر کے شائع کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے کا آغاز عزیز گرامی مولانا عبداللہ میمن صاحب نے کیا اور مسجد بیت المکرم گلشن اقبال کراچی میں احقر کی ہفتہ وار مجلس کے خطبات انہوں نے (اصلاحی خطبات) کے عنوان سے شائع کئے جن کی اب تک گیارہ (۱۱) جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں اور بفضلہٖ تعالیٰ ان کا فائدہ ملک میں اور بیرون ملک محسوس کیا گیا۔

اس قسم کے بیانات لاہور، فیصل آباد اور بعض دوسرے مقامات پر ہوئے، لاہور میں کچھ عرصے سے ماہانہ خطبات کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ ان بیانات کو خواہر زادہ عزیز مولانا محمد ناظم اشرف سلمہ نے کیسٹوں کی مدد سے مرتب کر کے شائع کیا۔ اب ایسے دس بیانات کا مجموعہ (اصلاحی مواعظ) کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض خطبات میری نظر سے گذرے ہیں، بعض نہیں۔ لیکن الحمدللہ، دوسرے اہل علم نے بھی ان پر نظر ثانی کی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ انشاء اللہ وہ مفید ہونگے۔ اللہ تعالیٰ جملہ مرتبین کو جزائے خیر عطاء فرمائیں۔ اس مجموعے کو قارئین کے لئے نافع بنائیں اور احقر کے لئے اپنے فضل وکرم سے گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ اور ذخیرہ آخرت بنادیں۔ آمین ثم آمین

نہ بہ حرف ساختہ سرخوشم ، نہ بہ نقش بستہ مشوشم
نفسے بیادِ تو می زنم، چہ عبارت وچہ معانیم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۹، شعبان المعظم ۱۴۱۹ء کراچی

﴿عرض ناشر﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالی کا نام عالم اسلام کے دینی حلقوں میں مشہور ومعروف ہے۔ حضرت کی شخصیت ان ہستیوں میں شامل ہے جن کی مثالیں زمانے میں گنی چنی ہوتی ہیں۔ آپ کی تصانیف کے ساتھ ساتھ آپ کے ان خطبات اور مواعظ نے بھی تمام مکتبہ فکر سے خراج تحسین حاصل کیا جو بے شمار لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب لا چکے ہیں۔ جامع مسجد بیت المکرم کراچی میں حضرت ہفتہ وار اصلاحی درس فرماتے ہیں جو اصلاحی خطبات کے نام سے کئی جلدوں میں چھپ چکے ہیں۔ لاہور کے علماء اور عوام کا کافی عرصے سے یہ اصرار تھا کہ حضرت لاہور تشریف لاکر ماہانہ وعظ فرمایا کریں۔ چنانچہ حضرت نے اس کو قبول فرمایا تھا اور ماہانہ وعظ کے لئے ہر ماہ لاہور تشریف لاتے تھے۔ ان مواعظ کو کیسٹوں کی مدد سے ضبط کرلیا گیا ہے۔ اور ہم اللہ کے فضل وکرم سے حضرت کے مواعظ کو (اصلاحی مواعظ) کے نام سے شائع کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں جس میں چند مواعظ لاہور کے ہیں، چند دوسرے مقامات کے۔ اصلاحی مواعظ کی جلد اول اور دوم کی غیر معمولی مقبولیت کے بعد اب جلد سوم حاضر خدمت ہے اور جلد چہارم پر بھی اللہ کے فضل سے کام جاری ہے۔ ہم اصلاحی مواعظ کی تیاری میں حضرت مولانا یوسف خان صاحب مدظلہم (استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور) اور حضرت مولانا راحت علی ہاشمی صاحب مدظلہم (استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی) کے بے حد ممنون ہیں کہ ان حضرات نے اپنے قیمتی اوقات میں سے وقت نکال کر اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کے سائے کو ہمارے سروں پر

تادیر سلامت رکھے اور اس خدمت کو جاری رکھتے ہوئے دین کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

مدیر۔ محمد ناظم اشرف
بیت العلوم۔ ۲۰ نابھہ روڈ، پرانی انارکلی، لاہور

اجمالی فہرست

فہرست

بسم اللہ کی اہمیت

موضوع = بسم اللہ کی اہمیت

بیان = جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

ضبط و ترتیب = محمد ناظم اشرف (فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی)

مقام = جامع مسجد نیلا گنبد، لاہور

باہتمام = محمد ناظم اشرف

ناشر = بیت العلوم۔ ۲۰ نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی، لاہور

فون: ۷۳۵۲۳۸۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿بسم اللہ کی اہمیت﴾

بعد از خطبہ:

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نومن به ونتوكل عليه، و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضلّ له ومن يضلله فلا هادى له واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له و اشهد ان سيدنا و سندنا و نبينا و مولانا محمداً عبده و رسوله صلى الله تعالىٰ عليه و على آله واصحابه و بارك وسلم تسليما كثيراً كثيراً امابعد فاعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم بسم الله الرحمٰن الرحيم O

الحمد لله رب العلمين O الرحمٰن الرحيم O مالك يوم الدين O اياك نعبد و اياك نستعين O اهدنا

الصراط المستقيم ○ صراط الذين انعمت عليهم
غير المغضوب عليهم ولا الضالين ○ صدق الله
العظيم ....

شکران نعمت

میں سب سے پہلے آپ تمام حضرات کو اور خود اپنے آپ کو اس بات کی مبارک باد دیتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں اپنی زندگی میں ایک اور رمضان سے سرفراز فرمایا۔ نہ جانے ہم میں سے کتنے بھائی اور دوست ایسے ہیں جو گذشتہ سال رمضان اور اس سے متعلق کاموں میں ہمارے ساتھ شریک تھے لیکن اس سال وہ رمضان کی نعمتوں سے بہرہ ور نہیں ہو سکے، سب سے پہلے اللہ جل جلالہ کا شکر ادا کرنے کی ضرورت ہے کہ اس نے یہ رمضان اپنی رحمت اور فضل و کرم سے ہمیں عطا فرمایا۔ اللہ جل جلالہ کی رحمت سے امید ہے کہ لاکھوں کوتاہیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے رمضان میں کیے ہوئے اعمال کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں گے۔

عبادت کی توفیق پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے

بعض اوقات ہمیں جس عبادت کی کبھی توفیق ہو جاتی ہے اس کے بارے میں ہم ناقدری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، یعنی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ عبادت اس طرح انجام نہیں پائی جس طرح انجام پائی جانا چاہیے تھی، اس کا حق ہم سے ادا نہیں ہو سکا، اس کے آداب ہم بجا نہیں لا سکے تو اس عبادت کی ناقدری ہمارے

دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے اور اس ناقدری کی وجہ سے ہم اس عبادت کی توفیق ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جو توفیق محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، یہ بھی ان کا کرم ہے اور بہت بڑا انعام ہے، لہٰذا اس کی ناقدری کسی بھی حالت میں کسی بھی مومن کو نہیں کرنی چاہئے۔ نمازوں کے بارے میں یہ جملہ بکثرت ہماری زبانوں پر آتا رہتا ہے کہ جی ہماری نماز کیا ہم تو ٹکریں مارتے ہیں، لیکن یاد رکھئے یہ کلمہ شکر اور قدر کا کلمہ نہیں ہے اس سے احتراز کرنا چاہئے۔ پہلے اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے اپنی بارگاہ میں سجدہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی، ورنہ کتنے ہی ایسے افراد ہیں جو اس نعمت سے اب تک محروم ہیں۔

ہم نے رمضان میں روزے رکھے، تراویح پڑھی اور قرآن پاک پڑھنے کی توفیق ہوئی بے شک ہماری طرف سے وہ کوتاہیوں میں بھری ہوئی تھی، لیکن پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دی گئی توفیق کا شکر تو ادا کرلو کہ کتنے ہیں جن کو یہ توفیق نصیب ہی نہیں ہوئی کہ ان کے گھروں میں پتہ ہی نہیں چلتا کہ رمضان کب آیا تھا اور کب چلا گیا، ہمیں اللہ تعالیٰ نے ان میں سے نہیں بنایا اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

عبادت میں کوتاہی پر استغفار

جہاں تک عبادتوں میں اپنی طرف سے کوتاہی کا تعلق ہے تو یاد رکھو کہ کوئی بھی عبادت اللہ تبارک وتعالیٰ کی خالقیت کا اور اس کی ربوبیت کا حق ادا نہیں کرسکتی، لہٰذا ہماری طرف سے عبادات میں جو کوتاہیاں اور جو غلطیاں ہوئی ہیں ان پر استغفار کریں۔

نبی کریم ﷺ کا معمول

صحیح حدیث میں ہے کہ رسول کریم سرور دو عالم ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جب بھی نماز سے فارغ ہوتے تو نماز سے فارغ ہونے کے فوراً بعد تین مرتبہ فرماتے تھے۔ استغفر اللہ۔ استغفر اللہ۔ استغفر اللہ۔

نماز کے بعد استغفار کی وجہ

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ استغفار کے معنی ہیں گناہوں سے معافی مانگنا، آدمی نے جب کوئی گناہ کیا ہو تو استغفار کرے، جب کوئی غلطی کی ہو تو معافی مانگے، جب کوئی گناہ ہی نہیں کیا تو نماز کے بعد استغفار کا کیا مطلب؟ اللہ جل شانہ کے حضور نماز پڑھی تو نماز کے بعد استغفار کیوں؟ وجہ درحقیقت یہ ہے کہ اشارہ اس بات کی طرف کرنا مقصود ہے کہ نماز تو بے شک ہم نے پڑھ لی لیکن جیسا پڑھنے کا حق تھا وہ ہم سے ادا نہیں ہو سکا، لہٰذا ہماری نماز میں جو کوتاہیاں ہیں اس پر ہم استغفار کر رہے ہیں۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَ بِالْاَ سْحَارِهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾

''یہ وہ لوگ ہیں جو رات میں بہت کم سوتے ہیں (یعنی رات کے وقت اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہوئے ہیں، عبادت کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور نمازیں پڑھ

رہے ہیں اور سحری کے وقت وہ اللہ کے حضور استغفار کرتے ہیں''۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضور نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یہ عجیب بات ہے کہ ساری رات تو کھڑے ہوکر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہے تو صبح کو استغفار کس بات کا کرتے ہیں، اپنے گناہوں کا یا کسی اور بات کا، تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ وہ استغفار اپنی رات کو کی گئی عبادت پر کرتے ہیں کہ رات کو کی گئی عبادت میں اے اللہ آپ کی ربوبیت کا حق ہم سے ادا نہیں ہو سکا اس واسطے ہم اس پر استغفار کرتے ہیں۔

نبی کرم ﷺ کی عبادت کا حال

خود نبی کریم سرور دو عالم ﷺ ساری ساری رات کھڑے رہتے ہیں پاؤں پر ورم آ رہا ہے۔ مگر پھر فرما رہے ہیں ماعبدناك حق عبادتك ''اے اللہ ہم آپ کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکے''۔ماعرفناك حق معرفتك ۔''اے اللہ ہم آپ کی معرفت کا حق ادا نہیں کر سکے'' تو جب نبی کریم ﷺ عبادت کا حق ادا نہیں کر سکے تو ہم اور آپ کس طرح ادا کر لیں گے۔

چونکہ انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکتا تو اس کی صورت یہ بتائی کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد استغفار کر لیا کرو ان کی رحمت ایسی ہے کہ وہ عبادات میں کوتاہیوں اور غلطیوں کو معاف کرنے کے بعد ان کی تلافی فرمائیں گے اور وہی چیز عطا فرمائیں گے جس کا انہوں نے وعدہ فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فخر فرمانا

حدیث میں آتا کہ جب مسلمان رمضان کا مہینہ گزارنے کے بعد عیدگاہ میں جمع ہوتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس مجمع کو دیکھ کر فرشتوں کے سامنے فخریہ انداز فرماتے ہیں، کیونکہ یہی وہ فرشتے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا تھا کہ جو مخلوق آپ پیدا کر رہے ہیں یہ زمین میں فساد پھیلائے گی۔ تو جب یہ لوگ عیدگاہ میں جمع ہوتے ہیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ اے میرے فرشتو! یہ بتلاؤ کہ جو مزدور اپنا کام پورا کر دے اس کا صلہ کیا ہونا چاہئے؟ وہ عرض کرتے ہیں بار الٰہی اس کا صلہ یہ ہونا چاہئے کہ اس کو اس کی اجرت پوری ادا کر دینی چاہئے، باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دیکھو یہ میرے بندے ہیں، میں نے ان کے ذمہ ایک کام لگایا تھا، ماہ رمضان میں انہوں نے اُسے پورا کر دیا اور آج جو میرے پاس جمع ہوئے ہیں وہ مجھ سے دعا کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں، پھر باری تعالیٰ اپنے عزت اور جلال کی قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ میری عزت کی قسم، میرے جلال کی قسم، میرے کرم کی قسم، میرے علو کی قسم کہ آج میں ان سب کی مغفرت کر دوں گا، اور نہ صرف مغفرت کر دوں گا بلکہ ان کی برائیوں کو حسنات میں بدل دوں گا کہ آج یہ اپنا کام پورا کرنے کے بعد جمع ہوئے ہیں اور دعا و استغفار کر رہے ہیں، اس لیے ان سے جو کوتاہیاں ہوئیں میں وہ معاف کر کے حسنات میں بدل دوں گا۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیٴ عارفی صاحبؒ کا خوش ہونا

ہمارا معمول تھا کہ ہم لوگ نماز عید کے بعد سب سے پہلے اپنے شیخ

حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ جب ہم حاضر ہوتے تو وہ بڑے شاداں اور فرحاں نظر آتے اور فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ بڑے خوش قسمت لوگ ہیں کہ آج اللہ تعالیٰ نے ہمارے سارے گناہ معاف فرما دیئے اور ہماری برائیوں کو حسنات میں تبدیل کر دیا، اس لئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ عبادت اللہ کے دربار میں قبول ہوئی، اور اپنی کوتاہیوں پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو۔

کیونکہ حدیث میں آتا ہے۔ من صام رمضان ایمانا واحتساباً غفرله ماتقدم من ذنبه ''جو شخص رمضان کے روزے رکھ لے ایمان کے ساتھ اور ثواب حاصل کرنے کی نیت کے ساتھ تو اس کے سارے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے'' تو کیا گناہوں کے معاف ہونے میں کچھ شک ہے؟

حضرت صدیق اکبرؓ کا مقولہ

ایک مقولہ حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ کا بڑے کام کا اور بڑے یاد رکھنے کا ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص کام انجام دینے کے بعد دو کلمے کہہ لے تو شیطان کہتا ہے اس شخص نے میری کمر توڑ دی، وہ دو کلمے یہ ہیں۔
(۱) الحمد اللہ (۲) استغفر اللہ۔

نماز پڑھی تو نماز کے بعد کہہ لیا الحمد اللہ۔ استغفر اللہ تو شیطان کہتا ہے کہ اس شخص نے میری کمر توڑ دی۔

عبادت کے بارے میں شیطان کا حربہ

شیطان کا حربہ عبادت کے بارے میں دو ہی قسم کا ہوتا ہے۔ ایک حربہ

اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ عبادت کے بارے میں بندے کو کبر و ناز میں مبتلا کر دیتا ہے کہ میں بڑا عبادت گزار ہو گیا، میں نے اللہ کی بڑی عبادت کی، بندے کے دل میں عبادت پر ناز اور گھمنڈ پیدا کرتا ہے، تو الحمد اللہ کا لفظ شیطان کی کمر توڑ دیتا ہے کہ یہ جو میں نے کیا درحقیقت توفیق کسی اور کی ہے یہ سب کچھ اسی کی عطاء ہے۔

دوسرا حربہ شیطان کا یہ ہوتا ہے کہ شیطان اس بات پر لگا دیتا ہے کہ تیری عبادت کیا، تیری نماز کیا، تیرا سجدہ کیا، اور اس سجدہ کی ناقدری کر کے دل میں مایوسی پیدا کر دیتا ہے کہ ساری عمر ہو گئی نماز پڑھتے پڑھتے لیکن نماز پڑھنے کا جو حق تھا وہ ہم سے ادا نہیں ہو سکا، جب وہ حق ادا نہیں ہوتا تو نماز پڑھنے کا کیا فائدہ؟ یہ مایوسی شیطان دل میں پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا علاج حضرت ابوبکر صدیقؓ نے استغفر اللہ کے ذریعہ بتادیا کہ عبادت میں جو کوتاہی ہوئی اس پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو۔

عبادت کے بارے میں دل میں شبہ اور اس کا جواب

ایک مرتبہ میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی صاحبؒ کی خدمت میں ایک صاحب حاضر ہوئے، انہوں نے آکر عرض کیا کہ حضرت یہ نماز میں جو ہم پڑھتے ہیں، دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کچھ حاصل نہیں ہوا، اور ایسی نماز کیا ہوئی کہ دل کہیں دماغ کہیں اور خیالات کہیں، اور نماز میں شہوانی اور نفسانی نہ جانے کیسے کیسے خیالات آتے رہتے ہیں، اور ہم ایسی حالت میں جا کر نماز میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں، تو یہ نماز کیا ہوئی یہ تو ٹکریں ہوئیں، اس پر حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی صاحبؒ نے اس شخص کا علاج کرنے کے لئے فرمایا کہ بھائی تمہارا سجدہ تو واقعی بڑا گندہ ہے کہ اس میں نفسانی اور شہوانی خیالات بھرے ہوئے ہیں، یہ سجدہ تو واقعی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کے قابل نہیں

ہے، تو تم ایسا کرو کہ یہ سجدہ تم مجھے کرو کیونکہ ایسا نفسانی اور شہوانی خیالات والا سجدہ اللہ تعالیٰ کے لائق تو ہے نہیں، جب یہ سجدہ اللہ تعالیٰ کے لائق نہیں تو یہ سجدہ تم مجھے کرو، تو اس شخص نے کہا کہ نعوذ باللہ آپ کو سجدہ کیسے کروں سجدہ تو صرف اللہ کو کیا جاتا ہے، تو اس پر حضرت نے فرمایا کہ جب تم کہہ رہے ہو کہ یہ سجدہ کسی اور کو کرنا جائز نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ یہ سجدہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، یہ پیشانی کہیں اور جھک نہیں سکتی، یہ پیشانی کہیں اور ٹک نہیں سکتی یہ پیشانی صرف ایک ہی بارگاہ کے لیے ہے، تو جب انہوں نے پیشانی ٹیکنے کی توفیق دے دی تو پھر اس کی ناقدری کر کے اس کو ٹکر کیوں کہتے ہو، انہوں نے تمہیں توفیق دی اس پر شکر ادا کرو اور دماغ میں جو الٹے سیدھے خیالات آتے ہیں ان پر استغفار کرو۔ کیونکہ یہ سجدہ کہیں اور ہو نہیں سکتا لہٰذا اس کو گندہ سجدہ کہنا ناپاک سجدہ کہنا درست نہیں ہے۔

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ سجدہ جس کو تیرے آستاں سے نسبت ہے

دو کام شکر اور استغفار

اب یہ سجدہ بارگاہ میں پیش کرنے والا سجدہ ہے، اس لیے اس کی ناقدری مت کرو، ہاں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان پر استغفار اور شکر کرو۔ جب بھی کسی عبادت کی اللہ تعالیٰ توفیق دے دیں اور یہ دو کام ہم اور آپ کر لیں تو انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی ذات سے پوری امید رکھنی چاہئے کہ وہ اپنی رحمت سے اس کو قبول فرمائیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہماری سب کمزوریوں اور کوتاہیوں سے اور ہماری نفسیات سے واقف ہیں، انہوں نے ہمیں طریقہ بتلا دیا کہ جب بھی کوئی نیک عمل کرنے کی

توفیق ہوجائے تو ہمارے سامنے حاضر ہو کر شکر کرو اور استغفار کرو اس لیے اللہ کی رحمت پر امید کرتے ہوئے یہ دو کام ہم میں سے ہر شخص کو کرنے چاہیں، ایک شکر دوسرا استغفار۔

بنیاد......سورۃ فاتحہ

اس مجلس کا اعلان چونکہ درس قرآن کا ہوتا آ رہا ہے اس لیے آئندہ ہم اس کا آغاز سورۃ فاتحہ سے کریں گے اور ہم یہاں پر سورۃ فاتحہ کو بنیاد بنائیں گے، کیونکہ یہ سورۃ فاتحہ پورے قرآن مجید کا خلاصہ ہے اس کے ذیل میں انشاء اللہ تعالیٰ ہمارے تمام مسائل آجائیں گے۔ سورۃ فاتحہ وہ سورۃ ہے کہ جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ سورۃ پورے قرآن مجید کا خلاصہ، عطر اور نچوڑ ہے۔

سورۃ فاتحہ ایک نعمت

حدیث میں فرمایا گیا کہ یہ سورۃ فاتحہ وہ نعمت ہے جو حضور نبی کریم ﷺ سے پہلے کسی بھی امت کو عطا نہیں کی گئی، اور یہ کل سات آیتیں ہیں، لیکن اس کے اندر پورے قرآن مجید کا خلاصہ آ گیا ہے، اسی لئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر نماز کی ہر رکعت میں اس سورۃ فاتحہ کو لازمی قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ہر رکعت میں ضروری ہے اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿لا صلوٰۃ لمن لم یقرا بفاتحہ الکتاب﴾

''جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ہی نہیں ہے''

تو ایسی چیز جس کو ایک طرف سارے قرآن مجید کا خلاصہ عطر اور نچوڑ قرار دیا گیا،

اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی، کچھ تو راز ہوگا کہ اس کو لازمی قرار دیا گیا، ہم سورۃ فاتحہ کو پڑھتے ہیں لیکن بے دھیانی کے عالم میں فکر کیے بغیر، سوچے سمجھے بغیر پڑھتے ہیں کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں، کیا زبان سے نکال رہے ہیں۔ سورۃ فاتحہ کے پیچھے جو مضامین اور ہدایت ہیں، جو معارف وانوارات ہیں، ان کی تھوڑی سی جھلک ہمارے ذہن میں آجائے اور پھر ہم سورۃ فاتحہ پڑھیں تو اس کا لطف ہی کچھ اور ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے وہ سمجھ عطا فرمادیں۔ آمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو سمجھنے کی ضرورت

غور کریں تو سب سے پہلے سورۃ فاتحہ اور ہر سورۃ کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے سے ہورہا ہے، لہٰذا سب سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ آیت ایسی ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ جب بھی کوئی سورۃ نازل ہوتی تو دوسورتوں کے درمیان فصل پیدا کرنے کے لیے حضرت جبرائیل امین اس آیت کو بھی لے کر آیا کرتے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے معنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا مطلب یہ ہے کہ "اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور نہایت رحم والا ہے میں شروع کرتا ہوں۔ قرآن مجید کو بھی اللہ تعالیٰ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا، ہر سورۃ کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا، اس کے ساتھ ہی حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ صرف قرآن ہی نہیں بلکہ دنیا کا ہر (جائز) کام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہونا چاہیے فرمایا:

﴿کل امر ذی بال لم یبدا بسم اللہ فھوا قطع﴾

"کہ ہر وہ کام جو ذرا سی بھی اہمیت رکھتا ہو اگر وہ بسم اللہ سے نہ شروع کیا جائے وہ ادھورا ہے"۔

ہر کام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرو

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو کام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ نامکمل اور ادھورا ہے، اس میں برکت نہیں ہوتی، آپ نے فرمایا کہ ہر کام کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا کرو، سوار ہو تو بسم اللہ، صبح کو بیدار ہو تو بسم اللہ، گھر سے نکلو تو بسم اللہ، ہر کام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہونا چاہئے، یہ تعلیم دی ہمیں نبی کریم سرور دو عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے۔

ہر کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کی وجہ

ہر کام سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کی تعلیم کیوں دی گئی؟ کیا یہ کوئی منتر یا وظیفہ ہے جو اس کے پڑھنے کی تعلیم دی جا رہی ہے؟ اگر غور کریں تو اس کے پیچھے ایک بہت بڑی حکمت ہے، اور وہ حکمت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو عبادت کے لیے پیدا کیا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اس کو جائز دنیاوی مشاغل میں لگنے کی اجازت بھی دے دی تو جب انسان دنیا کے مشاغل میں لگتا ہے تو وہ مشاغل اس کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، اس میں انہماک پیدا کرتے ہیں، اور یہ انسان کی کچھ طبیعت اور جبلت ہے کیونکہ دنیا اس کو اپنی آنکھوں سے نظر آتی ہے لہٰذا اسکی اہمیت کچھ دل میں زیادہ پناہ گزیں ہو جاتی ہے۔ آخرت چونکہ آنکھوں سے نظر نہیں آتی اس لیے اس کی اہمیت پس پشت چلی جاتی ہے۔ اب انسان دنیا کے کام میں لگا ہوا ہے، روزی کما رہا ہے، ملازمت اور زراعت کر رہا ہے، تجارت اور

صنعت کر رہا ہے، اس میں لگا ہوا ہے، اس میں لگنے کے نتیجہ میں دن رات اسی کے خیالات اور تصورات اس کے ذہن میں آتے رہتے ہیں اور اس میں انہاک پیدا کرتے ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ سے اور آخرت سے ان چیزوں کی وجہ سے غافل ہوتا رہتا ہے اور یہ غفلت ہی درحقیقت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

غفلت کو دور کرنے کا راستہ

اس لیے اس غفلت کو دور کرنے کا راستہ یہ ہے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے اللہ جل شانہ کے ساتھ ایسا رشتہ اور تعلق قائم ہو جائے کہ خواہ وہ کسی بھی کام میں لگا ہوا ہو، لیکن اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ جڑا ہوا ہو، اور اس کو صوفیائے کرام تعلق مع اللہ کہتے ہیں۔

تو غفلت کا علاج، تعلق مع اللہ ہے کہ آدمی تعالیٰ کے ساتھ اپنا رشتہ قوی کرے تاکہ اس کو یوں کہہ سکے۔

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

اللہ تعالیٰ سے کیسا تعلق قائم کرنا چاہیے؟

اللہ تعالیٰ کے ساتھ اگر مضبوط رشتہ اور تعلق قائم ہو جائے کہ دست بکار و دل بیار کا مصداق بن جائے۔ کہ ہاتھ تو دنیا کے کام میں لگے ہوئے ہیں لیکن دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ جڑا ہوا ہے، یہ صورت حال جب پیدا ہو جائے تو غفلت انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، نہ شیطان اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے اور نہ نفس اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہو جائے اور

رشتہ درست ہو جائے۔ یہ تعلق کس طرح پیدا ہو اور کس طرح انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہو کہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنا رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش گوار رکھے۔

ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف خیال رہنا چاہئے

ان لوگوں کو کچھ اندازہ ہوگا جن کو کسی شخص سے یا کسی ذات سے محبت ہوتی ہے تو ہر وقت ان کے دل و دماغ پر اسی شخص کا خیال رہتا ہے۔ ایک مرتبہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ نے اپنے شیخ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو خط میں لکھا کہ کچھ عرصہ سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں جہاں بھی ہوتا ہوں، جس جگہ بھی ہوتا ہوں، جس حال میں ہوتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ قلب کا رخ تھانہ بھون کی جانب ہے، اور اس کی مثال یہ دی جیسے قطب نما ہوتا ہے، اس قطب نما کی سوئی کو کہیں بھی گھما لو اس کا رخ شمال ہی کی جانب کو ہوتا ہے۔ حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ یہ صورت بدل کر اللہ جل جلالہ کی جانب ہو جائے، اور شیخ سے جو تعلق ہوتا ہے وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہوتا ہے، تو جب یہ تعلق پیدا ہو جائے کہ ہر وقت خیال اللہ تعالیٰ کی جانب ہو تو اس کو کہتے ہیں تعلق مع اللہ۔

ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرمانے لگے کہ جب میں پڑھتا تھا تو مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ حضور نبی کریم ﷺ جن کا ہر ایک رشتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے، وحی نازل ہو رہی ہے، فرشتے آ رہے ہیں، جنت اور جہنم کا مشاہدہ ہو رہا ہے، اور دنیا کی حقیقت آپ کے سامنے آ رہی ہے کہ

یہ دنیا کتنی بے حقیقت ہے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود آپ اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ کھیل رہے ہیں، آپ اپنی ازواج مطہرات کو رات کو کہانی سنا رہے ہیں۔ اور جس ذات پر وحی نازل ہو رہی ہے اتنا اونچا مقام کائنات میں آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا، وہ ذات حضرت عائشہؓ کو کہانی سنا رہی ہے، کہیں جا رہے ہیں تو راستہ میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ لگا رہے ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ پہلے تو بڑا تعجب ہوتا تھا کہ یہ کیسے ہوتا ہوگا۔ فرمایا کہ الحمد اللہ اب پتہ چل گیا کہ یہ دونوں چیزیں کس طرح سے جمع ہوسکتی ہیں کہ کھیل بھی ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق بھی جڑا ہوا ہے۔

حضرت خواجہ مجذوب صاحبؒ اور تعلق مع اللہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ سے سنا کہ حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحبؒ جو حضرت تھانویؒ کے بڑے خلیفہ تھے، فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ حضرت تھانویؒ کی وفات کے بعد امرتسر میں حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ کے مدرسہ میں اجتماع تھا۔ وہاں پر حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ، حضرت والد صاحب اور شاید حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ بھی تشریف فرما تھے۔ حضرت مجذوب صاحبؒ شعر بہت کہتے تھے، اور جب شعر کہتے تو گھنٹوں تک کہتے ہی رہتے، تو رات کے کھانے سے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد حضرت مجذوب صاحبؒ کافی دیر تک شعر سناتے رہے، جب کافی دیر گھنٹہ دو گھنٹہ گزر گئے تو حضرت مجذوب صاحبؒ نے پوچھا کہ بھائی یہ سب کچھ تو ہو گیا یہ بتلاؤ کہ اس پورے عرصہ میں کس کس کو اللہ تعالیٰ سے غفلت رہی؟ تو والد صاحب فرمانے لگے کہ اس

وقت ہم ایسے کاموں میں لگے ہوئے تھے کہ غفلت ہی غفلت میں تھے۔ حضرت مجذوب صاحبؒ نے فرمایا کہ الحمد اللہ مجھے غفلت نہیں ہوئی، یعنی اس پورے عرصے ہنسی مذاق میں بھی حضرت مجذوب صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ سے غفلت نہیں ہوئی۔ جب یہ کیفیت تعلق مع اللہ کی اللہ تعالیٰ انسان کو عطا فرما دیتے ہیں تو نہ شیطان اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے نہ نفس اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ کیونکہ ان کید الشیطان کان ضعیفا۔ لہٰذا اصل چیز جو حاصل کرنے کی ہے وہ ہے تعلق مع اللہ۔

تعلق مع اللہ حاصل کرنے کا طریقہ

اور اس تعلق مع اللہ کو حاصل کرنے کا ایک طریقہ حضور نبی کریم ﷺ نے یہ بتلایا کہ جب بھی کوئی کام کرو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر کرو! جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کام میں اللہ کے نام پر کر رہا ہوں، اگر اس کی توفیق نہ ہوتی تو میں یہ کام کیسے کر سکتا تھا۔ جب آدمی یہ سمجھ کر بسم اللہ پڑھے گا تو دنیا کے کسی بھی کام میں غافل شمار نہیں ہوگا۔

بسم اللہ پڑھنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اعتراف ہے

جب انسان نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر کھانا شروع کیا جو بظاہر تو معمولی سا عمل ہے لیکن درحقیقت یہ اعتراف ہے اس بات کا کہ یہ کھانا جو میرے سامنے آیا ہے یہ میری قوت بازو کا کرشمہ نہیں ہے، اور یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ میرے مالک کی عطا ہے۔

کرشمۂ خداوندی

جب ہم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر کھانا کھایا تو غفلت کہاں رہی، غفلت کا تو اسی لمحہ قلع قمع کر دیا، پہلے ہی قدم پر ذرا سمجھ کر بسم اللہ کہو کہ دیکھنے میں تو ایک نوالہ ہے جسے ہم نے ایک ہی لمحہ میں حلق سے نیچے اتار لیا، لیکن سوچو کہ اس نوالہ کو تمہارے تک پہنچانے کے لیے اللہ جل جلالہ نے کائنات کی کتنی قوتوں کو تمہاری خدمت پر لگایا، یہ روٹی کا ایک نوالہ تھا کہ کسی نے کس وقت زمین میں بیج ڈالا ہوگا، انسان کا کام تو اتنا ہی ہے کہ بیج زمین میں ڈال دے، اس بیج سے پودا بنانا اور کونپل بنانا تو انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ انسان کا اختیار صرف یہ ہے کہ زمین کو صاف کر کے بیج ڈال دے، اب وہ بیج زمین کے اندر کس طرح پرورش پاتا ہے اور پرورش پانے کے بعد کتنا چھوٹا سا بیج اور اس سے کتنی نازک کونپل نکلتی ہے کہ بچہ بھی اگر انگلی لگا دے تو وہ کونپل مرجھا جائے، لیکن وہ کونپل حیرت انگیز طور پر منوں وزنی زمین کا پیٹ پھاڑ کر باہر نکلتی ہے۔ اس بیج کو کونپل بنانا اور کونپل بنا کر زمین سے باہر نکال کر پودا بنانا یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾

''اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ جو تم زمین کے اندر بیج ڈالتے ہو کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم ہیں اسے اگانے والے''۔

(سورۃ الواقعہ آیت ۶۳۔۶۴)

آج اگر سارے سائنس دان مل کر چاہیں کہ اس مٹی سے باہر مٹی کے

اندر جو خود کار مشینیں اللہ نے لگا رکھی ہیں اس سے باہر اس کونپل کو پودا بنا کر نکالیں تو نہیں نکال سکتے۔ آج کوئی انسان ساری سائنس کی ساری طاقتیں استعمال کرنے کے بعد اسے باہر پودا نہیں بنا سکتا، یہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو یہ کام کرتی ہے کہ اس کام کے لیے بادل کہاں سے آتے ہیں اور زمین پر پانی برساتے ہیں، سورج اپنی شعاعیں زمین پر ڈال رہا ہے، ہوائیں چل رہی ہیں اور اس کی نشو ونما کر رہی ہیں تو تب جا کر کونپل سے پودا اور پودے سے درخت بنتا ہے، اور پھر اس کے اندر گندم نمودار ہوتی ہے، پھر کتنی طاقتیں ہیں جو اس گندم کو پیس رہی ہیں اور اس کو چھان رہی ہیں، پھر کس طرح مکان والوں تک اور پھر ہم تک پہنچا اور پھر تم نے ایک ہی لمحہ میں اس کو حلق سے نیچے اتار لیا اور اس کی لذت بھی حاصل کر لی، لیکن مطالبہ صرف اتنا ہے کہ یہ جو نوالہ تمہارے حلق تک پہنچا یہ تمہارے اپنے دست بازو کا کرشمہ نہیں بلکہ یہ کسی دینے والے کی عطا ہے، اس لئے اس پر بسم اللہ الرحمٰن پڑھو۔

مولانا جامی فرماتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ: یہ بادل، یہ ہوائیں، یہ آسمان، یہ سورج، یہ سب اس کام پر اللہ تعالیٰ نے لگا رکھے ہیں کہ تیرے ہاتھ میں ایک روٹی آجائے، اور ہاتھ میں روٹی آنے کے بعد صرف اتنا مطالبہ ہے کہ اس کو غفلت سے مت کھاؤ یہ سوچ کر کھاؤ کہ یہ کسی دینے والے نے دیا ہے، جب یہ سوچ کر کھاؤ گے تو یہ سارا کھانا غفلت سے عاری اور غفلت سے پاک ہو جائے گا اور اس طرح یہ عبادت بن جائے گا اور اس پر ثواب ملے گا۔ اور درحقیقت تم نے ابتداء میں بسم اللہ پڑھ کر غفلت کا خاتمہ کر دیا اور اب تم نے غفلت کی بجائے اللہ سے تعلق پیدا کر لیا۔

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ علماء تو فرماتے ہیں کہ جس جانور پر اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا جائے وہ حلال نہیں حرام ہے، اور صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ ہمارے خیال میں یہ مسئلہ صرف گوشت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر کھانے والی چیز کے ساتھ خاص ہے کہ جو کھانا اللہ کا نام لیے بغیر کھایا وہ روحانی اعتبار سے مردار ہے، چاہے فتویٰ اس پر حلال ہونے کا ہو۔ مفتی سے پوچھو گے تو وہ یہی کہے گا کہ حلال ہے لیکن روحانی انوار کے لحاظ سے وہ کھانا مردار ہے کیونکہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ ادھورا اور بے برکت والا ہے۔ اس لیے ہم صرف بسم اللہ کو گوشت کے ساتھ خاص نہیں کرتے بلکہ کھانے کے ساتھ بھی رکھتے ہیں، لہٰذا کھانے کے شروع میں پڑھو اور اگر شروع میں بھول گئے، درمیان میں یاد آیا تو اس وقت پڑھ لو: بسم اللّٰہ اولہ و اخرہ یعنی اول میں بھی اللہ کا نام اور آخر میں بھی اللہ کا نام۔

بسم اللہ پڑھنے سے غفلت دور اور اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے۔ کیونکہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہمیں غفلت سے نکال رہی ہے اور ہمارا راستہ اللہ تعالیٰ سے جوڑ رہی ہے۔ اس لئے ہر جائز کام کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لینی چاہئے۔

بسم اللہ کو پڑھنا فرض کیوں نہیں بنایا

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے بسم اللہ کی تاکید تو فرمائی لیکن ہر چیز پر بسم اللہ پڑھنا فرض نہیں بنایا، یہ بھی اس کی رحمت ہے کہ اگر فرض بنا دیتے تو نہ پڑھنے کا ہر وقت گناہ ہوتا اس لئے فرض نہیں بنایا، لیکن اتنا ضرور ہے کہ بغیر بسم اللہ والے کام میں برکت نہیں ہوتی۔

برکت کی حقیقت

یہ برکت بھی بڑی عجیب وغریب چیز ہے، یہ برکت وہ چیز ہے جو کسی گنتی میں نہیں آتی، کوئی میٹر اس کی پیمائش نہیں کر سکتا اور کوئی آلہ اس کو ناپنے کے لیے ایجاد نہیں ہوا۔

برکت کے معنی یہ ہیں کہ تھوڑی سی چیز میں زیادہ کام نکل آئے، اور بے برکتی کے معنی یہ ہیں کہ بہت ساری چیز ہے لیکن اس میں فائدہ نہیں ہو رہا۔ دیکھو کتنے لوگ ہیں جو تھوڑے وقت میں بہت سا کام کر لیتے ہیں، تھوڑا کھانا ہے لیکن پیٹ بھر گیا، تھوڑی سی نیند کی لیکن انسان کو بہت سی سیرابی حاصل ہو گئی۔ اور بہت سے لوگ ہیں جو بہت سا کھانا کھاتے ہیں لیکن اس سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے، اس کو کہتے ہیں بے برکتی۔تو جب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا تو تمہارا رابطہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑ دیا اور اب جو کام کرو گے اس میں برکت بھی ہوگی۔ وہ سارا کا سارا تعلق مع اللہ کے ماتحت آجائے گا اور غفلت تمہاری دور ہو جائے گی بشرطیکہ ذرا سمجھ کر پڑھا ہو۔

ہر کام سے پہلے بسم اللہ کا فلسفہ

پانی پی رہے ہو تو بسم اللہ یہ سوچ کر پڑھو کہ یہ پانی تمہارے ہاتھ میں پہنچانے کے لیے کائنات کی کتنی چیزیں استعمال ہوئی ہیں۔ سمندروں سے پانی کو بادلوں نے مون سون کی شکل میں اٹھایا، اور وہ مون سون بادل پانی اٹھا کر ہزاروں میل کا سفر طے کر کے تم تک پہنچے، اگر انسان سے کہا جاتا کہ بھائی ہم نے سارا

پانی سمندر میں بھیج دیا، جاؤ وہاں سے پانی اٹھا لاؤ اور پیا کرو، اول تو انسان کے بس میں ہی نہیں تھا کہ وہاں سے پانی لے آتا اور اگر لاتا بھی تو کڑوا پانی، پینے کے لائق ہی نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے مون سون کی شکل میں پانی اس طرح اٹھایا کہ اس میں خودکار مشین لگی ہوئی ہے کہ وہی کڑوا پانی جب بادل میں پہنچتا ہے تو میٹھا ہو جاتا ہے، اور پھر اس بادل کے ذریعہ تمہیں کارگوسروس مہیا کر دی، اور اگر تم سے کہا جاتا کہ سمندر سے پانی لیا کرو اور اس سے گزارہ کرو تو ذرا آج کوئی ہوائی جہاز پر منگوائے تو دو ہی دن میں دیوالیہ نکل جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسی پانی کو برسایا، اگر یہ کہا جاتا کہ ہم پانی برسا رہے ہیں، ہمارا کام ختم ہو گیا، اور اب تم سال بھر کے لیے جمع کر کے رکھو تو کسی انسان کے بس میں تھا کہ اسے سال بھر کے لیے ذخیرہ کر کے رکھتا؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان بادلوں کو اونچے اونچے پہاڑوں پر برسایا اور پہاڑوں پر خودکار فریزر لگے ہوئے ہیں جو اس پانی کو برف بنا کر پورے سال کے لیے ذخیرہ کر لیتے ہیں، قرآن نے اس طرف اشارہ کر دیا۔ ثم اسکنـه في الارض کہ ہم نے آسمان سے پانی اتارا اور زمین میں اس کو ٹھہرا دیا اور اسی طرح بادلوں کو پہاڑوں پر برسا کر برف کی سلیں لگا دیں، اور اگر یہ کہا جاتا کہ ہم نے تو پہاڑوں پر فریزر بنا دیا اب جاؤ اور جا کر وہاں سے لے آؤ تو کس کے بس میں تھا وہاں سے جا کر لانا؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے سورج کو حکم دیا کہ اپنی شعاعیں برسا اور شعاؤں کے ذریعہ پہاڑوں سے برف کو پگھلایا اور دریا بنائے اور دریا کی شکل میں پانی ساری دنیا میں پھیلا دیا، اور پھر ان دریاؤں کے ذریعہ زمین کی رگوں کا ایسا نظام بنایا کہ وہ پانی وہاں سے رس رس کر زمین کے چپہ چپہ پر پہنچ گیا کہ ذرا زمین کھودو اور وہاں سے پانی نکل آئے۔ اور وہ پانی تمہارے پاس آیا اور تم نے ایک

ہی لمحہ میں غٹ غٹ کر کے سارا پانی پی لیااور کبھی نہ سوچا کہ یہ پانی تم تک کس طرح پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا:

﴿اَفَرَئَیْتُمُ الْمَاءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ﴾

''کہ دیکھو یہ پانی جوتم پی رہے ہو، آسمان سے ہم نے اتارا ہے یا تم نے اتارا''۔ (سورۃ الواقعہ آیت ۶۸۔۶۹)

اس لیے پانی پینے سے پہلے جو بسم اللہ کا حکم دیا جارہا ہے وہ درحقیقت اس بات کا اعتراف ہے کہ میرے مالک نے یہ جو پانی ہم تک پہنچایا ہے نہ جانے کتنی طاقتوں کوخرچ کرنے کے بعد پہنچایا،اور جب بسم اللہ پڑھ کر بندے نے ایک مرتبہ یہ اعتراف کرلیا تو اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ جڑ گیا، تعلق جڑنے کے نتیجہ میں کم از کم اس پانی پینے میں غفلت نہیں ہوگی،اور وہ اس کے لیے عبادت بن جائے گا۔ اور یہ سارا فلسفہ ہے ہر کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا، اگر ہر کام سے پہلے بسم اللہ پڑھو گے تو اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا ہو جائے گااور اس پر ثواب ملے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر کام سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کی توفیق عطاء فرمائیں اور ہمیں دین کی صحیح سمجھ اور اُس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔

آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

اللہ کا شکر

﴿اللہ کا شکر﴾

بعد از خطبہ مسنونہ!

الحمد لله رب العلمين ○ الرحمٰن الرحيم ○ مالك يوم الدين ○ اياك نعبد و اياك نستعين ○ اهدنا الصراط المستقيم ○ صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين ○ صدق الله العظيم …………

سورۃ فاتحہ سے ابتداء کی وجہ

پچھلی مجلس میں میں نے یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ ہم اپنی گفتگو اور سوچ بچار کا آغاز سورۃ فاتحہ سے کریں گے کیونکہ اللہ جل جلالہ نے بھی اپنی کتاب کا آغاز سورۃ فاتحہ سے فرمایا ہے۔

اور تمام مفسرین اور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سورۃ فاتحہ پورے قرآن کا عطر اور نچوڑ ہے، اور اسی وجہ سے ہر مسلمان پانچ وقت کی نماز کی ہر رکعت

میں سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے، اور اس کو پڑھنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ جب اس کلام کی ابتدائی منزل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی رحمت سے صحیح فہم عطا فرمائیں گے اور انشاء اللہ تعالیٰ اس کی برکات عمل کی صورت میں بھی نمودار ہوں گی۔

رحمٰن اور رحیم دونوں صفتیں حضور ﷺ کی تشریف آوری کا امتیاز ہیں

پچھلے اجتماع میں میں نے مختصراً بسم اللہ الرحمن الرحیم پر کچھ بیان کیا تھا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے صرف ایک حصہ کا پچھلی مرتبہ بیان ہوا تھا وہ ہے بسم اللہ، یعنی اللہ کے نام پر شروع کرتا ہوں'' اس کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ کی دو صفتیں بیان ہو رہی ہیں، ایک رحمٰن دوسرے رحیم، یعنی اس اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے۔ یہ جو دو صفتیں اللہ تبارک و تعالیٰ کی بیان فرمائی گئیں ہیں یہ حضور اقدس ﷺ کی تشریف آوری کا امتیاز ہیں۔

مشرکین بھی اپنے کام کی ابتداء اللہ کے نام سے کرتے تھے

حضور ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے جو مشرکین تھے وہ بھی اللہ کے وجود کے قائل تھے، اور نہ صرف قائل تھے بلکہ ان کا معمول یہ تھا کہ جب بھی کوئی کام شروع کرتے تو وہ بھی اللہ کے نام سے شروع کیا کرتے تھے، اور اللہ کا نام لینے کے لئے ان کے ہاں جو جملہ مقرر تھا وہ تھا باسمك اللهم کہ اے اللہ ہم آپ کے نام سے شروع کرتے ہیں، تو اللہ کے نام سے تو وہ بھی شروع کرتے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حضور ﷺ کا خاص امتیاز

لیکن جب سرور دو عالم ﷺ تشریف لائے تو باسمك اللھم کے بجائے فرمایا کہ یوں کہو کہ بسم الله الرحمن الرحیم یہ تبدیلی پیدا فرمائی۔ اس تبدیلی میں جو بنیادی امتیاز ہے وہ الرحمن الرحیم کی صفت ہے ورنہ اللہ کا نام تو مشرکین بھی لیتے تھے، البتہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ الرحمٰن الرحیم کا اضافہ یہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد ہوا۔ چونکہ یہ دونوں صفتیں الرحمن الرحیم آگے سورۃ فاتحہ میں بھی آ رہی ہیں اس لئے ان کے متعلق جو بات ہے اسے میں اس آیت تک موقوف کر رہا ہوں۔

الحمد للہ رب العالمین

اب جو سورۃ فاتحہ شروع ہو رہی ہے اس کی پہلی آیت ہے۔ الحمد الله رب العالمین یہ سورۃ فاتحہ کی پہلی آیت ہے جس سے سورۃ فاتحہ شروع کی گئی۔ الحمد الله رب العالمین کے معنی یہ ہیں کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو پروردگار ہے تمام جہانوں کا۔ الحمد الله رب العالمین کا صحیح مفہوم اگر انسان کے دل میں بیٹھ جائے تو اس کے سارے معاملات خود بخود درست ہو جائیں گے۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم شروع ہو رہا ہے اور قرآن ایک خاص پیغام، ایک خاص تعلیم اور ایک خاص ہدایت لے کر آیا ہے، اور وہ تعلیم اور ہدایت وہ ہے جس میں عقائد بھی ہیں، توحید اور رسالت کی دعوت بھی ہے اور آخرت کی دعوت بھی ہے، اس میں عبادات بھی ہیں، نماز بھی ہے، روزہ بھی ہے، زکوٰۃ بھی ہے اور حج بھی ہے۔ اس میں معاملات بھی ہیں، جائز ناجائز، حلال اور

حرام اور بیع وشراء وغیرہ بھی اس میں موجود ہیں، اس میں معاشرت بھی ہے کہ ایک دوسرے سے کس طریقہ سے ملنا چاہئے، اس میں اخلاق بھی ہیں کہ کونسے اخلاق انسان کو اختیار کرنے چاہیں اور کون سے نہیں، یہ ساری تفصیلات اس پیغام ہدایت میں موجود ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ قرآن شروع ہو رہا ہے سورۃ فاتحہ سے، تو اس کی ابتدا میں نہ عقائد کا کوئی مسئلہ بیان ہوا، نہ توحید و رسالت کا، نہ آخرت کا، نہ نماز کا حکم، نہ روزے کا حکم، نہ زکوۃ کا حکم اور نہ حج کا کوئی حکم، بلکہ شروع یہاں سے کیا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو رب ہے تمام جہانوں کا۔ اس میں کیا راز ہے کہ سارے مسائل اور سارے احکامات کو چھوڑ کر ابتدا کی جا رہی ہے اللہ رب العالمین کی تعریف سے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد سے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے شکر سے، اس سے درحقیقت اس بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اور راز اس میں یہ ہے (واللہ سبحانہ اعلم) کہ الحمد للہ کا صحیح مفہوم اگر انسان کے دل میں بیٹھ جائے اور ذہن نشین ہو جائے اور یہ الحمد للہ کا فقرہ جو پیغام دے رہا ہے اس پیغام کو اگر انسان اپنے اندر جذب کر لے تو سارے عقائد، ساری عبادات، سارے معاملات، سارے اخلاق اور ساری معاشرت، خود بخود درست ہو جائے گی۔ اگر انسان الحمدللہ رب العالمین کا صحیح مفہوم سمجھ لے اور اس سے نکلنے والے پیغام کو اپنے اندر جذب کر لے تو اس کے سارے کے سارے معاملات خود بخود درست ہو جائیں گے، اس لئے سب کو چھوڑ کر بات الحمدلله رب العلمين سے شروع کی گئی۔

دنیا میں کسی بھی چیز کی تعریف درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے

یہاں بات سمجھنے کی یہ ہے کہ اس میں الحمد اللہ کہہ کر ایک دعویٰ کیا۔

الحمدلله کے معنی یہ ہیں کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں اوراس کائنات میں کوئی دوسرا حقیقی معنی میں تعریف کے لائق نہیں ہے، اگر کوئی ہے تو صرف اللہ جل جلالہ کی ذات ہے۔ اور ساتھ میں یہ جملہ خبریہ بھی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کسی کی تعریف ہوگی حقیقت میں وہ تعریف اللہ رب العالمین کی ہی ہوگی، چاہے تعریف کرنے والا اللہ کے نام کے بجائے کسی اور کا نام لے رہا ہو۔ اس لئے کہ ایک انسان کی عام عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کی تعریف کی جائے حقیقت میں وہ تعریف اس چیز کی نہیں ہوتی بلکہ وہ تعریف اس چیز کے بنانے والے کی ہوتی ہے۔ اگر آپ لاہور کی شاہی مسجد کی تعریف کریں کہ بڑی عالیشان مسجد ہے، بڑی شاندار بنائی گئی ہے، اس کا نقشہ بڑا اعلیٰ درجہ کا تیار کیا گیا ہے، یہ بڑی مستحکم ہے، جتنی چاہے آپ تعریف کر لیں وہ تعریف نہ اس پتھر کی ہے، نہ اس عمارت کی ہے، نہ اس مینار کی ہے اور نہ اس گنبد کی ہے، حقیقت میں تعریف اس معمار کی ہے کہ جس نے یہ شاہی مسجد کا نقشہ بنایا اور اسکو اس شاندار اعلیٰ طریقہ سے تعمیر کیا۔

اگر آپ کسی کپڑے کی تعریف کرتے ہیں تو حقیقت میں تعریف اس کپڑے کی نہیں ہوتی کہ کپڑا بڑا خوبصورت ہے، بڑا شاندار لباس ہے، حقیقت میں یہ تعریف اس شخص کی ہے کہ جس نے اس کپڑے کو بنایا یا اس کا ڈیزائن تیار کیا۔ تو دنیا میں جس کسی کی بھی چیز کی تعریف ہوگی تو وہ درحقیقت اس چیز کی نہیں بلکہ اس کے بنانے والے کی تعریف ہوگی کہ جس نے وہ چیز بنائی۔ پھر اس کائنات کی ہر چیز کے اندر یہ حکم جاری ہوگا، لہٰذا اگر آپ نے شاہی مسجد کی تعریف کی ہے تو شاہی مسجد کی تعریف درحقیقت اس کے معمار کی تعریف ہے، لیکن معمار کے پاس وہ ذہن

کہاں سے آیا، معمار کے پاس وہ سوچ کہاں سے آئی، اس کے دل میں یہ ڈیزائن کس نے ڈالا اور اس کو یہ قوت کارکردگی کس نے عطا کی، کہ اتنی عالیشان عمارت کھڑی کر دی، درحقیقت اگر غور کرو گے تو آخر میں یہی بات آئے گی کہ وہ معمار کی تعریف درحقیقت معمار کی تعریف نہیں ہے بلکہ معمار کے بنانے والے کی تعریف ہے کہ جس نے اس معمار کو بنایا، جس نے اس معمار کا ذہن تیار کیا اور جس نے اس معار کے ذہن کی تخلیق کی۔

سائنسدانوں کی ترقی کی تعریف درحقیقت اللہ کی تعریف ہے

آج دنیا میں سائنسدانوں کی تعریفیں ہو رہی ہیں کہ انہوں نے سائنس کو عروج اور کمال پر پہنچایا اور واقع میں پہنچا دیا اور دنیا میں انقلاب برپا کر دیا، کمپیوٹرز کے ذریعہ انسان کے دماغ کا کام کیا جا رہا ہے اور ربوٹ تیار ہو رہے ہیں، وہ انسان کے طریقہ سے کام کر رہے ہیں، انسان چاند پر اور مریخ پر پہنچ رہا ہے، یہ ساری کی ساری جو ترقیات ہیں، یہ سائنسدانوں کی طرف منسوب کی جارہی ہیں اور یہ تعریف ساری دنیا میں ہو رہی ہے، جن آدمیوں کی نگاہیں محدود ہیں وہ ان سائنسدانوں پر پہنچ کر رک جاتی ہیں۔ لیکن جس کو اللہ نے نور بصیرت عطا کیا ہو وہ اس سے تھوڑا آگے بڑھتا ہے اور آگے بڑھ کر کہتا ہے بے شک یہ ترقیات بڑی حیرت انگیز ہیں، بڑی شاندار ہیں اور ان سائنسدانوں نے یہ ترقیاں کی ہیں لیکن ان سائنسدانوں کے ذہن میں اس چھوٹے سے دماغ کے اندر اگر بھیجہ نکال کر دیکھا جائے تو شاید آدھے سیر کا بھی نہ ہو، اس چھوٹے سے دماغ کے اندر اللہ تبارک و تعالیٰ نے کیا احکامات پیدا فرما دیئے، اس دماغ کے اندر اللہ تعالیٰ نے کیا

کیا قوتیں عطا فرما دیں کہ اس دماغ کو کام میں لا کر انسان کہاں سے کہاں پہنچ گیا، تو اگر انسان حقیقت پسند نگاہ سے دیکھے تو یہ جتنی تعریفیں ہو رہی ہیں حقیقت میں یہ تعریف اللہ تعالیٰ کی ہے جس نے یہ دماغ بنایا ہے۔

انسان کا دماغ ایک نعمت ہے

آج اس دماغ کا یہ حال ہے کہ سارے سائنسدان اس بات پر متفق ہیں کہ یہ دماغ جو انسان کے اندر ہے اس میں ایک چھوٹا سا خلیہ ہے، وہ ایک ارب واقعات کو محفوظ رکھنے کی طاقت رکھتا ہے، اور ایک انسان کے دماغ میں اربوں خلیات ہیں، ان خلیات کے ذریعہ انسان کو یادداشت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ جو ہوتا ہے کہ انسان کوئی چیز بھول گیا یا یادداشت جاتی رہی تو وہ خلیات ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں، ان میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل ہوتا رہتا ہے، اگر وہ عمل ختم ہو گیا تو یادداشت جاتی رہی ان خلیات کے اندر اربوں واقعات انسان کے چھوٹے سے دماغ میں محفوظ ہیں۔ اور اس چھوٹے سے دماغ کے اندر اب بھی سارے ڈاکٹر صاحبان اور میڈیکل سائنس کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ جتنا انسان کا دماغ ہے اس دماغ کا صرف ۱/۸ حصہ ایسا ہے کہ جس کے بارے میں ہمیں پتہ ہے کہ اس کا عمل یہ ہوتا ہے اور اس کا فنکشن یہ ہے کہ یہ فلاں فلاں کام کرتا ہے، باقی انسان کے دماغ کے سات حصے ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں معلوم نہیں کہ یہ کیا کام کرتے ہیں، اور اس کے نتیجہ میں اگر کوئی خرابی وہاں پیدا ہو جائے تو کوئی ڈاکٹر اسکو چھونے پر بھی تیار نہیں ہوتا، اس حصہ کو چھو کر نہ جانے انسان کے جسم کی

کونسی صلاحیت ختم ہو جائے گی۔ تو اس چھوٹے سے دماغ کی بھی سات حصے غیر معلوم ہیں اور صرف ایک حصہ معلوم ہوا ہے، اس ایک حصہ سے انسان کام لے کر کہاں سے کہاں پہنچ رہا ہے اور اس دماغ کے ذریعہ سے کیا کچھ ترقیات کر رہا ہے۔ بے شک یہ ترقیات ہیں لیکن ذرا اس بنانے والے کو تو دیکھو جس نے انسان کو یہ دماغ عطا فرمایا اور اس دماغ کے بل بوتے پر اس نے کائنات کو مسخر کر کے رکھ دیا ہے۔

اللہ نے کائنات کی ہر چیز کو انسان کیلئے مسخر کر دیا

ارشاد ربانی ہے:۔

"هُوَ الَّذِيْ خَلَقَلَكُمْ مَافِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا" کہ زمین اور آسمان میں جو بھی چیزیں ہیں سب تمہارے لئے مسخر کر دیں ہیں" صرف اور صرف اسی دماغ کے بل بوتے پر۔

میرے والد ماجد قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو ہم سواری پر بیٹھتے ہیں تو دعاء یہ تلقین فرمائی گئی کہ ہر سواری پر بیٹھتے ہوئے یہ دعاء پڑھ لو کہ "سبحان الذی سخرلنا هذا وما کنا له مقرنین" "پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لئے یہ سواری مسخر کر دی، مسخر کرنے کے معنی ہیں کہ رام کر دی یعنی ہمارے تابع کر دی اور ہم اس سے کام لے رہے ہیں، تو میرے والد ماجدؒ فرمایا کرتے تھے اب تو خیر ریلوں اور ہوائی جہازوں کا زمانہ ہے، پہلے زمانہ میں گھوڑے اور گدھے اس کام کے لئے استعمال کئے جاتے تھے، تو گھوڑے کا حال یہ ہے کہ

ایک چھوٹا سا بچہ اس کے منہ میں لگام ڈال کر اس کے اوپر سوار ہو کر جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے، کبھی گھوڑے نے پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ بھئی میں تجھ سے دس گنا زیادہ طاقتور ہوں، یہ کیا ظلم ہے کہ تو میرے اوپر سواری کرتا ہے میں تیرے اوپر سواری کیوں نہ کروں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو انسان کے لئے مسخر کر دیا کہ اس گھوڑے کے منہ میں لگام ڈال کر جہاں چاہے لے جاسکتا ہے یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کرشمہ ہے، اگر دیکھا جائے تو قوت کے اعتبار سے تو گھوڑے کی قوت کہاں اور انسان کی قوت کہاں، آج ساری قوتیں ہارس پاور کی شکل میں ناپی جارہی ہیں کہ اس میں اتنے ہارس پاور پائے جاتے ہیں اس میں اتنے ہارس پاور پائے جاتے ہیں، لیکن انسان کو یہ دماغ عطا فرما کر اور اس دماغ کے اندر عقل عطاء فرما کر اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو ایسا بنا دیا کہ وہ ساری کائنات کو مسخر کرتا جارہا ہے۔ تو حقیقت میں اس کائنات میں جس چیز کی بھی تعریف کرو گے تو وہ تعریف آخر میں جا کر اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اللہ جل جلالہ کی تعریف ہے، اس لئے فرمایا جارہا ہے کہ الحمد للہ رب العالمین یعنی تمام تعریفیں رب العالمین کے لئے ہیں۔

الحمد اللہ...... ایک دعویٰ

الحمد للہ یہ ایک دعویٰ ہے اور رب العالمین جو اگلا جملہ ہے یہ اس دعویٰ کی دلیل ہے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پروردگار ہے تمام جہانوں کا، انسانوں کے عالم کا بھی، حیوانوں کے عالم کا بھی، جنات کے عالم کا بھی، آسمانوں کا بھی اور زمینوں کا بھی۔

الحمدللہ سے قرآن شروع کر کے ایک خاص پیغام دیا جا رہا ہے

دوسری بات یہ کہ قرآن کریم کو الحمدلله سے شروع کر کے اس بات پر متنبہ فرما دیا کہ اگر اللہ کے حکم کے مطابق اور اس کی رضا کے مطابق اس دنیا میں زندگی گزارنا چاہتے ہو تو اس کا پہلا قدم اور اس کی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ اللہ کی تعریف کرنے اور شکر کرنے کی عادت ڈالو۔

شکر اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے کی کنجی

اللہ کا شکر اور اس کی حمد اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات پر عمل کرنے کی کنجی ہے۔ وہ اس طرح کہ اسلام کی جتنی بھی تعلیمات ہیں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ ادا کرو، حج کرو اور فلاں چیز حلال ہے فلاں چیز حرام ہے، یہ جو ساری پابندیاں اور قیود بظاہر آدمی کو مشکل لگتی ہیں۔ نفس تقاضہ کرتا ہے کہ یہ کام کروں لیکن اسلام نے اس کو حرام قرار دے دیا، دل چاہ رہا ہے کہ سوؤں لیکن اسلام نے حکم دیا کہ نہیں اٹھو نماز پڑھو، بظاہر یہ ساری چیزیں مشکل لگتی ہیں اور اللہ کا شکر اور اس کی حمد یہ کنجی ہے اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات پر عمل کرنے کی۔

اللہ تعالیٰ کی محبت سے تمام مشکلات آسان ہو جائیں گی

بظاہر تو اسلام کے ان احکامات پر عمل کرنا بہت مشکل لگتا ہے، اس مشکل کو دور کرنے کا واحد علاج یہ ہے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرو۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آ جائے گی تو یہ ساری مشکلات آسان ہو جائیں گی۔ کیونکہ محبت ہی وہ چیز ہے جو انسان کے لئے دشواریوں کو آسان بناتی ہے، مشکلات

کو حل کرتی ہے اور محبت کے ذریعہ انسان بڑے سے بڑے سخت کام کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ دیکھو کہ صبح سویرے اٹھنا اور اٹھتے ہی بس پکڑنے کے لئے جلدی سے گھر سے نکلنا، اور دفتر میں جا کر آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ادا کرنا اور مسلسل محنت کرنا اور وہاں سے واپس شام کو ایسے وقت میں واپس آنا کہ جس وقت بچے سو گئے ہوں، سارا دن محنت کے اندر گذارنا مشکل کام ہے کہ نہیں، لیکن چونکہ دل میں محبت اس بات کی ہے کہ سارا مہینہ کام کرنے کے بعد جب اگلا مہینہ شروع ہوگا تو اس وقت تنخواہ ملے گی اور اس تنخواہ کی محبت سے ساری تلخیاں برداشت ہو جاتی ہیں اور ساری مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ بھائی یہ تو بڑا مشکل کام ہے صبح سویرے اٹھتے ہو اور سارا دن محنت کرتے ہو اور رات کو کہیں جا کر گھر میں پہنچتے ہو، یہ سب مشکل کام ہے اس لئے یہ سب مشکل کام چھوڑ دو لاؤ تمہارا کام چھڑوا دیتے ہیں تو وہ کہے گا کہ خدا کے لئے ایسا نہ کیجئے یہ مصیبت میرے لئے بہتر ہے بہ نسبت اس کام کے کہ آپ میرے روزگار پر لات مار دیں اور میری ملازمت چھڑوا دیں۔ تاجر آدمی دن رات اپنی محنت کے اندر لگا ہوا ہے لیکن ساری محنت برداشت اس لئے کر رہا ہے کہ اس نفع سے محبت ہے جو اس کے نتیجہ میں ملنے والا ہے، تو محبت وہ چیز ہوتی ہے جو بڑی سے بڑی چیز کو آسان کر دیتی ہے۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ''از محبت تلخہا شیریں شود'' کہ محبت کے ذریعہ تلخ سے تلخ کام اور مشکل سے مشکل کام آسان ہو جاتا ہے۔

محبت کی ایک عجیب مثال

دیکھو ماں ہے جو اپنے بچہ کو پالتی ہے اور اس طرح پالتی ہے کہ سردی کا موسم ہے جاڑے کا موسم ہے، کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے اور رات کا وقت ہے

ماں لحاف میں لیٹی ہوئی ہے اور بچہ نے کوئی پیشاب پاخانہ وغیرہ کر دیا۔ اب وہ اس سردی کے اندر اٹھ کر جا رہی ہے اس کو دھو رہی ہے، اور یہ کام اس کے لئے کس قدر مشکل کام ہے جو وہ کر رہی ہے، کوئی کہے کہ یہ مشکل تمہیں اس بچہ کی خاطر پڑی ہے لاؤ دعا کرتے ہیں کہ یہ بچہ تمہارا نہ رہے کہ جس نے تمہیں اس مشکل میں ڈال دیا یا آئندہ تمہارا کوئی بچہ نہ ہو جو تمہیں اس مشکل میں ڈالے، تو وہ ماں کہے گی ہزارہاں ایسی مشکلات میرے لئے آسان ہیں کیونکہ اس بچہ سے مجھے محبت اور تعلق ہے۔ تو ساری مشکلات ساری پریشانیاں درحقیقت جو چیز آسان کر دیتی ہے وہ ہے محبت، جس دن یہ محبت پیدا ہو گئی تو ساری مشکلات آسان ہو جائیں گیں۔ ہمارے لئے شریعت کے جتنے احکام ہیں، حلال وحرام، جائز ناجائز، فرض، واجب، سنت، مستحب وغیرہ، ان کو آسان بنانے کا ایک ہی نسخہ ہے اور وہ نسخہ یہ ہے کہ اللہ کی محبت ہمارے دل میں پیدا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ محبت ہم سب کو عطا فرما دیں تو یقین رکھو کہ سب مشقتیں آسان ہو جائیں گی۔

احکامات پر عمل کرنے کا آسان ترین نسخہ اللہ کی محبت ہے

حضور نبی کریم سرور دو عالم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ”قرۃ عینی فی “ میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز ہے، حالانکہ نماز ویسے تو مشقت ہی کا کام ہے لیکن وہ آسان اس لئے ہوگئی کہ اس کے اندر لطف آنے لگا اور اس کے اندر لذت حاصل ہونے لگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پناہ گذیر ہے اور اس محبت کے نتیجہ میں ساری مشقتیں آسان ہیں، رات کو اٹھنا بھی مشکل نہیں، پھر صبح سویرے اٹھنا بھی مشکل نہیں، پھر روزے رکھنا بھی مشکل نہیں پھر انسان کو اس مشقت میں بھی لذت آتی ہے کہ یہ مشقت میں اپنے محبوب کی خاطر برداشت کر رہا ہوں، جب

آدمی یہ تصور کرتا ہے کہ یہ میں اپنے محبوب کی خاطر برداشت کر رہا ہوں تو اس مشقت میں بھی مزا آتا ہے۔ تو سارے احکام شریعت پر عمل کرنے کا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ اللہ کی محبت دل میں پیدا ہو جائے۔

محبت حاصل کرنے کا طریقہ شکر ہے

اللہ کی محبت کیسے حاصل ہو کہ جس سے یہ سارے کام آسان ہو جائیں، اس محبت کو حاصل کرنے کا سب سے آسان اور بہترین نسخہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرو! جتنا اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرو گے، اس کی نعمتوں کا استحضار کرو گے، اس کی نعمتوں کو سوچو گے اور اس کا دھیان کرو گے اتنی ہی محبت میں ترقی ہوتی جائے گی۔ آپ اپنے روزمرہ زندگی کی مثال دیکھ لیجئے کہ جب آپ ماں کو دیکھتے ہیں کہ اس نے میری خاطر کیا کیا مشقتیں برداشت کیں، کتنے دن تک مجھے پیٹ میں رکھا، اس نے کتنی مشکلات برداشت کیں، اس نے کتنی مشکل سے مجھے پالا اور اب جب بھی کوئی مصیبت کا موقع آتا ہے تو یہ ماں میرے لئے اپنی جان بھی حاضر کر دیتی ہے۔ جب آدمی اس کی قربانیوں کو دیکھتا ہے اور اس کے انعامات کو دیکھتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کو اس سے محبت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ باپ سے بھی محبت پیدا ہوتی ہے کیونکہ دیکھتا ہے کہ باپ نے میرے ساتھ کیا کیا احسانات کئے ہیں، جتنے انسان کے محسن ہیں ان کے احسانات کا انسان جتنا تصور کرے گا اتنی ہی ان سے محبت پیدا ہوگی۔ ایک آدمی ہے جو روز صبح کو آپ کے گھر میں ہدیہ لا کر ڈال دیتا ہے، آپ نے چاہے اس کو دیکھا بھی نہ ہو لیکن خود بخود آپ کے دل میں محبت پیدا ہو جائے گی کہ کون ایسا مخلص آدمی ہے جو روزانہ مجھے کوئی نہ کوئی تحفہ دے کر چلا جاتا ہے۔ تو اللہ جل جلالہ کے انعامات کا جتنا

استحضار انسان کرے گا اور جتنا اس کا دھیان کرے گا تو اتنی ہی اللہ تبارک و تعالیٰ سے محبت پیدا ہو جائے گی ،اور محبت پیدا کرنے کا نسخہ ہے شکر۔گویا دین پر عمل کرنے کا آسان نسخہ ہے محبت پیدا کرنا اور محبت حاصل کرنے کا آسان ترین نسخہ ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا۔ اسی لئے قرآن نے جگہ جگہ حکم دیا ہے کہ شکر ادا کرو۔ایک جگہ آتا ہے۔ اعملو آل داؤد شکراً و قلیل من عبادی الشکور "اے داؤد کے اہل خاندان شکر کرو اللہ کا اور میرے بندوں میں شکر کرنے والے بہت ہی کم ہیں"۔ غرض قرآن کا آغاز کیا جا رہا ہے اللہ کے شکر سے اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ اے انسان اگر تو اپنی خیر چاہتا ہے تو اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ اللہ کا شکر گذار بندہ بن جا، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کر اس کو سوچ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر اور یہ کہہ کہ الحمدللّٰہ رب العالمین اور یہی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کا نسخہ ہے۔

انسان مشکل میں اللہ کو پکارتا ہے

قرآن مجید نے جگہ جگہ انسان کی ایک خصلت بیان کی ہے اور قرآن نے جگہ جگہ اس کا ایک عجیب مزاج بیان فرمایا ہے کہ جب آسان کو کوئی مشکل پڑتی ہے تو وہ اس مشکل میں اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے کہ اے اللہ میں اس مشکل میں مبتلا ہو گیا ہوں یہ مجھ سے دور کر دیجئے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب وہ مشکل کام اس سے دور کر دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے ہمیں پکارا ہی نہیں اور ہم سے کبھی اس مشکل کو دور کرنے کی درخواست کی ہی نہیں۔

دوسری خصلت انسان کی یہ ہے کہ اگر ہم نے انسان کو ہزار انعامات دیئے ہوں اور ایک تکلیف دے دی ہو تو انسان ان ہزار انعامات کو بھلا دے گا اور

اس تکلیف کو لے کر بیٹھ جائے گا کہ یہ تکلیف مجھے پہنچ گئی۔

مفتی اعظمؒ کی ایک حکیمانہ بات

مجھے اپنے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی ایک بڑی حکیمانہ بات یاد آئی کہ میری ایک ہمشیرہ ہیں جو الحمد للہ اب بھی حیات ہیں، ان کی عمر کے تقاضہ سے ان کے دانت بار بار ٹوٹ رہے تھے اور کچھ دن بعد ایک نہ ایک دانت نکلوانا پڑتا تھا، تو ایک مرتبہ انہوں نے والد صاحبؒ سے کہا کہ یہ دانت بھی بڑی عجیب چیز ہیں کہ یہ آتے ہوئے بھی تکلیف دیتے ہیں اور جاتے ہوئے بھی تکلیف دیتے ہیں کہ کبھی اس دانت میں درد ہو رہا ہے کبھی اس دانت میں درد ہو رہا ہے، کبھی اس دانت کو نکلوانا پڑتا ہے اور کبھی اس دانت کو نکلوانا پڑتا ہے۔ میرے والد ماجدؒ نے فرمایا کہ خدا کی بندی! تمہیں دانت کی دو ہی باتیں یاد آ رہی ہیں کہ آتے ہوئے بھی اس نے تکلیف دی تھی اور جاتے ہوئے بھی اس نے تکلیف دی اور یہ جو پچاس سال تک اس سرکاری مشین سے فائدہ اٹھایا وہ تمہیں یاد نہ آیا، اس کا تو ذکر کر رہی ہو کہ اس نے آتے ہوئے بھی تکلیف دی اور جاتے ہوئے بھی تکلیف دی اور یہ درمیان میں جو عرصہ گزرا اس میں نجانے کتنی غذائیں کھائیں، کتنی لذتیں حاصل کیں، اس کا خیال نہیں آیا۔

اگر انسان کو اللہ والوں کی صحبت میسر نہ ہو اور اللہ والوں کی نگاہ نہ پڑی ہو تو انسان کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ ذرا سی تکلیف کو لے کر بیٹھ جاتا ہے اور ہزاروں نعمتیں جو عین اسی وقت اس انسان کے اوپر اللہ کی طرف سے بارش کی طرح برس رہی ہیں ان کو بھول جاتا ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَکَفُوْرٌ کہ انسان بڑا ناشکرا ہے۔

حضرت مولانا اصغر حسین صاحبؒ کے شکر کا ایک عجیب واقعہ

میرے والد ماجدؒ کی ایک بات یاد آئی ...... میرے والد صاحبؒ کے ایک استاذ حضرت مولانا اصغر حسین صاحبؒ تھے جو حضرت میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے اور بڑے عجیب وغریب بزرگ تھے۔ ان کے عجیب و غریب واقعات ہیں، ان کو شاید اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کی یادیں تازہ کرنے کے لئے پیدا فرمایا تھا۔ حضرت والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ مجھے پتہ چلا کہ وہ بیمار ہیں اور بخار چڑھا ہوا ہے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور جا کر دیکھا تو شدید بخار کی حالت میں تپ رہے تھے، اور جس طرح بخار کی حالت میں انسان کو غفلت ہوتی ہے اس طرح کی غفلت کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے جا کر پوچھا کہ حضرت کیسے مزاج ہیں؟ تو فرمانے لگے کہ بھائی الحمد للہ بہت اچھا ہوں، اللہ کا شکر ہے کہ آنکھ میں درد نہیں ہو رہا، اللہ کا شکر ہے کان میں درد نہیں ہو رہا، اللہ کا شکر ہے ناک بھی ٹھیک ہے، اللہ کا شکر ہے زبان ٹھیک ہے، اللہ کا شکر ہے دل ٹھیک ہے، اللہ کا شکر ہے کہ جگر ٹھیک ہے، جتنی تکلیفیں نہیں تھیں وہ پہلے شمار کرائیں اور اس پر شکر ادا کیا، اور پھر فرمایا کہ ہاں بخار ہو رہا ہے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی دور فرما دیں۔

نعمت کا استحضار پہلے اور تکلیف بعد میں

تو جو نعمتیں میسر ہیں ان کا استحضار پہلے کرو اور اگر کوئی تھوڑی بہت تکلیف آئی ہے تو اس تکلیف کا ازالہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو، لیکن یہ کیا کہ آدمی اس تکلیف کو لے کر بیٹھ جائے اور جو بے شمار نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں ان کو بھول

جائے، یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہے اس کے بجائے انسان پہلے نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر تو ادا کرے پھر تکلیف کی بات کرے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں۔ ایک عالم وہ ہے جس میں راحت ہی راحت ہے آرام ہی آرام ہے، لذت ہی لذت ہے، تکلیف اور غم کا نام نہیں، وہ عالم جنت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عطا فرمائے (آمین) دوسرا عالم وہ ہے جس میں تکلیف ہی تکلیف ہے، عذاب ہی عذاب ہے، پریشانی ہی پریشانی ہے، غم ہی غم ہے، راحت اور خوشی کا نام نہیں، اور وہ جہنم ہے، اللہ تعالیٰ اس سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے (آمین)، تیسرا عالم وہ ہے جس میں راحت بھی ہے، تکلیف بھی ہے، خوشی بھی ہے، غم بھی ہے، پریشانی بھی ہے اور امن وسکون بھی ہے، یعنی دونوں کا مخلوط آمیزہ اور دونوں کا مجموعہ ہے یہ وہ عالم ہے جس سے ہم اور آپ گذر رہے ہیں یعنی عالمِ دنیا۔

تکالیف کا تناسب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں ہمیشہ کم ہوتا ہے

اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس دنیا میں مجھے راحت ہی راحت ملے، تکلیف کبھی نہ ہو یہ کبھی نہیں ہوسکتا، بڑے سے بڑا سرمایہ دار، بڑے سے بڑا حکمران، بڑے سے بڑا صاحب اقتدار یہ منزل حاصل نہیں کرسکتا کہ اس کو دنیا میں کبھی غم اور تکلیف نہ پہنچے۔ تکلیف تو پہنچے گی چاہے مسلمان ہو، چاہے کافر، چاہے عام مسلمان ہو، چاہے ولی اللہ ہو، چاہے صحابی ہو یا پیغمبر ہو، کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، تکلیف بھی ہوگی راحت بھی ہوگی۔ لیکن ہمیشہ یاد رکھو کہ کیسی ہی بڑی سے

بڑی تکلیف آ جائے اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں اس کا تناسب ہمیشہ کم ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یقیناً زیادہ ہوں گی۔ اگر تکلیف کا تناسب نعمتوں سے بڑھ جائے تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا، جب تک زندگی ہے اس وقت تک یہ ضرور ہوگا کہ تکلیفیں بھی ہوں گی اور راحت بھی ہوگی، لیکن ہمیشہ اگر غور کرو تو راحتیں زیادہ ہوں گی اور تکلیفیں کم ہوں گی۔ یہ کائنات کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔

انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہے

انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرے اور تکلیف پر صبر کر کے اسی سے مانگے کہ یا اللہ یہ تکلیف مجھ سے دور فرما دے۔ اور اگر ناشکری کی کہ ساری نعمتوں کو تو بھول گیا اور صرف تکلیف کو لے کر بیٹھ گیا اور اسی بنا پر ناشکری کی اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ تقدیر کا شکوہ کیا کہ میں ہی رہ گیا تھا اس مصیبت کے لئے، اس مصیبت کو اٹھانے کے لئے، (العیاذ باللہ) تو یہ بات خطرناک ہے۔ مسلمان کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کر کے اس کا شکر ادا کرے۔ دیکھو خدا نہ کرے کہ ایک بیماری آ گئی لیکن ذرا یہ تو دیکھو کہ وہ بیماری کتنی نعمتوں کے ساتھ لپٹ کر آئی ہے، اس بیماری کی حالت میں الحمد للہ تیماردار میسر ہیں، اس بیماری کی حالت میں اللہ کا شکر ہے کہ طبیب یا ڈاکٹر موجود ہیں، اس بیماری کی حالت میں الحمد اللہ علاج کے لئے پیسے موجود ہیں، یہ بیماری کی حالت الحمد اللہ دوسروں کی بیماری کی حالت سے بہتر ہے کہ دوسرے کی بیماری زیادہ تکلیف دہ اور میری بیماری اس کی نسبت کم تکلیف دہ ہے۔ اگر غور کرو تو اس بیماری کے اندر بھی اتنی نعمتیں نظر آئیں گی کہ انسان اس کا شکر ادا نہیں کر سکے گا۔ اس

لئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو۔ یہ جو قرآن کریم کا آغاز الحمد للہ رب العالمین سے ہو رہا ہے وہ ہمیں یہ پیغام دے رہا ہے کہ شکر گذار بننے کی عادت ڈالو کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کو سوچو اور نعمت کو سوچ کر کثرت سے اس پر شکر ادا کرو۔

قرآن کریم نے فرمایا اعملو آل داؤد شکراً کہ اے داؤد کی اولاد تم ایسا عمل کرو جس کے نتیجہ میں شکر پیدا ہو، مطلب یہ کہ شکرگزار بننے کی عادت یہ صرف زبان سے ایک مرتبہ الحمد للہ کہنے سے ادا نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے اس کے لئے ریاضت کرنی پڑتی ہے، ریاضت کرو اور شکر گذار بندے بن جاؤ۔

تکبر کی جڑ کاٹنے والی چیز شکر ہے

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفیؒ فرمایا کرتے تھے کہ تمہیں پتہ نہیں کہ شکر کیا چیز ہے۔ شکر وہ چیز ہے کہ اگر اپنی زندگی میں اس کی عادت ڈال لی تو یقین رکھو کہ تنہا یہ شکر تمہیں نہ جانے کتنے روحانی امراض سے نجات عطا کر دے گا۔ مثلاً ایک مثال دیتا ہوں کہ جتنے روحانی امراض ہیں ان کی سب سے بڑی جڑ تکبر ہے، یہ تکبر وہ ہے جس نے شیطان کو ہلاکت میں ڈالا، اس تکبر کی جڑ کاٹنے والی چیز شکر ہے۔ کسی زمانہ میں تکبر کا علاج کرنے کے لئے صوفیائے کرام بڑے بڑے مجاہدے اور بڑی بڑی ریاضتیں کروایا کرتے تھے، ایسے ایسے کام پر لگا دیتے تھے کہ جس میں انسان کا نفس اور اس کی انا کا پندار ٹوٹ جائے، ایسے کاموں پر مدتیں لگا کر کہیں جا کر تکبر کا علاج ہوتا تھا۔ تو میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اس کا علاج ریاضتیں اور مجاہدے ہیں جس کا

آسان طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو تو یہ تکبر کی بیماری خود بخود ختم ہو جائے گی۔

شکر کا مطلب

جب آدمی شکر ادا کرتا ہے کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے کھانا دیا، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ کپڑا دیا، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ رتبہ دیا، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ملازمت دی، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ منصب دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ میں تو اس لائق نہیں تھا نہ اس کھانے کے لائق تھا، نہ اس کپڑے کے لائق تھا، نہ اس رتبہ اور منصب کے لائق تھا یہ محض آپ نے اپنے فضل سے اپنی رحمت سے مجھے دے دیا۔ ورنہ اگر کسی کے ذمہ تمہارا کوئی قرض تھا اور اس نے وہ قرض ادا کر دیا تو کوئی شکر کی بات نہ ہوئی۔ لیکن کوئی شخص تمہارے استحقاق کے بغیر تم کو کوئی چیز دے دے تو یہ شکر کی بات ہے، تو جب اللہ کا شکر ادا کیا کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے آپ نے مجھے پیدا کیا، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے آنکھ دی، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے کان دیا، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے گویائی دی، معنی یہ ہیں کہ اے اللہ میں اس کا مستحق نہیں تھا، میرا کوئی حق نہیں تھا آپ پر، آپ نے جو عطاء فرمایا اپنے فضل کرم سے مجھے عطا فرمایا۔ تو جب پہلے ہی قدم پہ آپ نے یہ اعتراف کر لیا کہ میں مستحق نہیں تھا تو تکبر کی جڑ کٹ گئی۔

شکر کو ختم کرنے کے لئے شیطان کا حربہ

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ فرماتے تھے کہ جب شیطان کو

اللہ تعالیٰ نے جنت سے نکالا اور کہا کہ مردود ہو جا! تو چلتے چلتے اس نے بھی درخواست کی کہ یا اللہ نکال تو رہیں ہیں تو آپ مجھے اتنی عمر دے دیجئے کہ جب تک یہ دنیا قائم ہے اس وقت تک میں زندہ رہوں، تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ چل دے دی۔ اب جب مل گئی تو اس نے اپنے عزائم کا اظہار اس طرح کیا کہ اچھا جب آپ نے مجھے یہ عمر دے دی تو اب یہ عمر آدم کے بیٹوں کو گمراہ کرنے میں صرف کروں گا۔

قرآن نے فرمایا "لا تینھم من بین ایدیھم ومن خلفھم و عن ایمانھم و شمائلھم" کہ میں ان کو گمراہ کرنے کے لئے ان کے سامنے سے آؤں گا ان کے پیچھے سے آؤں گا، ان کے دائیں سے آؤں گا، ان کے بائیں سے آؤں گا، یعنی ان پر چاروں طرف سے حملہ کروں گا، اور میرے اس گمراہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا "ولا تجد اکثرھم الشکرین" کہ آپ ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائیں گے۔ یعنی انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے میرا حربہ یہ ہوگا کہ میں ان کے دلوں سے شکر کو کھرچ دوں گا اور ان کو ناشکرا بنا دوں گا۔ اس کے نتیجہ میں یہ گمراہی کے راستہ پر پڑ جائیں گے۔

تو پتہ چلا کہ شیطان کے حربوں سے اگر بچنا ہے تو اس کا راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر گذار بنو اور ہر ہر بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

مفتی اعظمؒ کا ارشاد ...... واقعات کو سیدھا پڑھنا چاہئے

محترم بھائی مصطفیٰ صادق صاحب نے بڑی اچھی بات یاد دلائی، میرے بڑے بھائی زکی کیفی مرحوم صاحب کی وفات کا واقعہ ہے کہ اس موقع پر حضرت

والد صاحب قدس سرہ بہت ہی سخت بیماری میں مبتلا تھے، دل کی تکلیف، بدن میں بہت سخت پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں اور وہ انگارے کی طرح دہک رہی تھیں، اس حالت میں اپنے محبوب ترین بیٹے کے انتقال کی خبر آئی، کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اس دکھ کو لے بیٹھتا، لیکن اس حالت میں جو خط انہوں نے لاہور میں بچوں کے نام لکھا وہ خط پورا پڑھنے کے قابل ہے، اس خط میں لکھا کہ حادثہ تو بڑا عظیم ہے لیکن میرے بچو! یہ غم اس واسطہ ہوتا ہے کہ ہم واقعات کو الٹا پڑھتے ہیں اور الٹا اس طرح پڑھتے ہیں کہ بھئی ایک جوان آدمی پچاس سال کی عمر اور ابھی کسی بچے کی شادی بھی نہیں ہوئی، ایک بچہ مدینہ منورہ میں پڑھ رہا ہے، اور اس حالت میں حج سے آکر اچانک ان کا انتقال ہوگیا۔ فرمایا کہ اس واقعہ کو سیدھا پڑھو اور وہ اس طرح کہ ہر انسان کا ایک ایک سانس اللہ کے ہاں لکھا ہوا ہے، لہٰذا وہ ایک متعین سانس لے کر آئے تھے، گنے چنے سانس لے کر آئے تھے، اتنے ہی سانس ان کو ملنے تھے اس سے کم و بیش ہو نہیں سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس حادثہ کے لئے کیا اسباب تمہاری تسلی کے لئے مہیا فرمائے کہ ایک بیٹا مدینہ منورہ میں پڑھ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حج کا سامان مہیا فرما دیا۔ حج کے لئے گئے تو وہاں بیٹے کو خدمت کا موقع دیا، وہاں بھی انتقال ہو سکتا تھا لیکن حج کی پوری عبادت مکمل کرنے کے بعد یہاں آئے اور یہاں پر آکر الحمد للہ اپنے عزیزوں سے مل بھی لئے اور ملنے کے بعد اپنے دوست احباب کی دعوت بھی کر دی اور ماں باپ سے کراچی سے مل کر آگئے، اور یہ سارے اسباب مہیا کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو بلایا۔ گویا واقعات کو الٹا پڑھنے کے بجائے واقعات کو سیدھا پڑھو تو پتہ چلے کہ یہ تکلیف جو تھی وہ کتنی رحمتوں کے ساتھ لپٹ کر آئی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا شکر

میرے والد ماجد قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ کس طرح کنویں میں ڈالے گئے، غلام بنائے گئے، قید خانہ میں رہے، مدتوں ماں باپ سے جدا رہے، باپ ان کے لئے روتا رہا اور بیٹا باپ کے لئے روتا رہا، سارے سال کے بعد جب مصر میں ملاقات ہوئی تو ایک بیٹا جس کو اس طرح کنویں میں ڈالا گیا ہو، غلام بنایا گیا ہو، قید کیا گیا ہواور فتنوں میں مبتلا کیا گیا ہو، وہ بعد میں باپ سے ملا تو بجائے زمانہ کا دکھڑا سنانے کے اپنے والد سے فرمایا، جس کو قرآن نے بھی ذکر کیا "ولقد احسن بہ اذا خرجنی من السجن وجاء بکم من البدد من بعد ان نزغ الشیطان بینی و بین اخوتی"

کہ اللہ نے کتنا احسان کیا میرے اوپر کہ مجھے قید خانہ سے نکال دیا۔ قید خانہ میں جانے کا ذکر نہیں کیا بلکہ ذکر یہ کیا کہ اللہ نے کتنا احسان کیا مجھ پر کہ مجھے قید خانہ سے نکال دیا، اور وجاء بکم من البدد اور اے میرے والدین میرے بہن بھائیوں پر کتنا اللہ نے احسان کیا کہ آپ کو دیہات سے لے آیا اور مجھ سے لا کر ملاقات کروائی۔ گویا جدائی کا ذکر نہیں بلکہ ملاقات کا ذکر کیا، اور پیچھے جو واقعات پیش آئے تھے اور بھائیوں نے ظلم کیا تھا، اس کو شیطان کے سر ڈال دیا کہ من بعد ان نزغ الشیطان بینی و بین اخوتی کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان ایک مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ساری تکلیفیں چھوڑ کر اللہ کی نعمتوں کا ذکر کیا اور یہی شکر گذار بندوں کا طریقہ ہے۔

الحمد للہ...... ہمیں کیا سبق دے رہا ہے

الحمد للہ کا لفظ جب شروع میں آگیا تو یہ ہمیں اور آپ کو یہ سبق دے رہا ہے کہ اگر قرآن سمجھنا چاہتے ہو تو پہلی سیڑھی اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر گذار بندے بن جاؤ اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

شکر ادا کرنے کا طریقہ

شکر ادا کرنے کا طریقہ میرے شیخ حضرت عارفی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈال لو اور شکر ادا کرنے کی رٹ لگاؤ! رٹ کا کیا مطلب کہ ہر وقت، ہر لمحہ سوچو، ہوا کا جھونک چلے اور اچھا معلوم ہو تو کہو، اللھم لک الحمد ولک الشکر ، گھر میں داخل ہوئے اور بچہ کھیلتا ہوا اچھا معلوم ہوا کہو اللھم لک الحمد ولک الشکر ، بھوک کے وقت کھانا سامنے آیا تو کہو اللھم لک الحمد ولک الشکر ، جو چھوٹی سے چھوٹی نعمت اور چھوٹی سے چھوٹی خوشی حاصل ہو اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو۔

مغربی تہذیب کے نتیجہ میں ہماری حالت

مغربی تہذیب کے نتیجہ میں آج ہماری حالت یہ ہوگئی ہے کہ جو چیزیں مسلمان کے ادنی خاندان کے اندر معروف اور متعارف تھیں وہ سب چھوٹ گئیں اور ادنی مسلمان خاندان کا یہ حال ہوتا تھا کہ پوچھا کہ بھائی کیسا مزاج ہے تو جواب ہوتا تھا کہ الحمد للہ اللہ کا شکر ہے۔ تو بچپن سے یہ مزاج بنایا جاتا تھا کہ الحمد للہ کہنے کی عادت ڈالو۔ آج اگر کسی بچے سے پوچھو کہ بیٹے کیسے ہو تو جواب میں وہ

کہے گا ٹھیک ہوں اور الحمد للہ شاذ و نادر ہی کسی کی زبان پر آئے گا، کیونکہ بچے کو سکھایا ہی نہیں گیا اور عادت ہی نہیں ڈالی گئی۔ انگریزوں کا طریقہ ہے کہ جب کوئی کسی سے پوچھتا ہے کہ بھئی کیسے مزاج ہیں تو انگریزی میں کہتے ہیں (Fine thankis) جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بھئی اچھا ہوں تمہارا شکریہ، یعنی شکریہ اس کا کہ تم نے مجھ سے میرا حال پوچھ لیا، آج وہی عادت ہمارے اندر ہے اور جو ان مغربی تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے ہیں یہ عادت ان کو بھی پڑ رہی ہے۔

تو اپنے بچوں کو پہلے دن سے الحمد للہ کہنے کی عادت ڈالو اور خود رٹ لگاؤ اور اس کی مشق کرو کہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

ایک بزرگ کا معمول

حضرت عارفیؒ فرماتے تھے کہ میرے ایک بزرگ تھے، ایک روز مجھے رات کو ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں جا کر دیکھا کہ جب سونے لگے تو میں دوسرے کمرہ میں تھا، تو میں نے اچانک دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر مستقل کہہ رہے ہیں (اللهم لك الحمد ولك الشكر) بڑی دیر تک بڑے جوش کے عالم میں پڑھتے رہے، تو میں نے حضرت سے پوچھا کہ حضرت کیا یہ معمول ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہر وقت مبذول رہتی ہیں لیکن ہم لوگ غفلت کے دھندوں میں پڑے رہتے ہیں۔ لہٰذا میں یہ کرتا ہوں کہ دن میں جو کچھ توفیق ہو گئی سو ہو گئی لیکن میں رات سونے سے پہلے جتنی دن بھر کی نعمتیں میرے تفکر میں آتی ہیں، میں ان کا تصور کرتا رہتا ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا ہوں کہ یا اللہ جب میں صبح کو اٹھا تو مجھے سواری مل گئی (اللهم لك الحمد ولك الشكر) جب میں دفتر گیا تو وہاں میرے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا (اللهم لك

الحمد ولك الشكر) جب میں گھر آیا تو گھر والے صحت مند تھے (اللھم لك الحمد و لك الشكر) یااللہ اس وقت مجھے یہ آرام دہ بستر میسر ہے (اللھم لك الحمد و لك الشكر) میں اس وقت مکان میں چھت کے نیچے بیٹھا ہوا ہوں کہیں باہر نہیں ہوں (اللھم لك الحمد ولك الشكر) فرماتے ہیں کہ جتنی نعمتیں میسر ہیں ان کا تصور کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر دیتا ہوں۔

اللہ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جس دن یہ کام کر لیا دیکھنا کتنی ترقی ہوتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت میں ترقی ہوگی تو یقیناً اسلام پر عمل آسان ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو شکر ادا کرنے کی توفیق عطاء فرمائے اور دین کی صحیح سمجھ اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین

استخارہ کا مسنون طریقہ

موضوع = استخارہ کا مسنون طریقہ
بیان = جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ
ضبط و ترتیب = مولانا محمد ناظم اشرف (فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی)
مقام = جامع مسجد بیت المکرم کراچی
باہتمام = محمد ناظم اشرف
ناشر = بیت العلوم ۔ ۲۰ نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی لاہور
فون ۔ ۷۲۵۱۲۸۳

﴿استخارہ کا مسنون طریقہ﴾

بعد از خطبہ:

امابعد﴿عن مکحول الازدیؒ قال سمعت ابن عمر رضی اللّٰہ عنہما یقول ان الرجل یستخیر اللّٰہ تبارك و تعالیٰ فیختارله فیسخط علی ربه عزوجل فلا یلبث ان ینظر فی العاقبة فاذا ھو خیرله﴾

(کتاب الزہد لابن المبارک ۔ زیارت الزہد)

بزرگان محترم اور برادران عزیز!

گذشتہ کئی ہفتوں سے صبر کا بیان چل رہا تھا، اور اب تک کی گفتگو کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسان میں رضاء بالقضا ہونی چاہئے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ فرمادیا اسی پر راضی رہو، اس لیے کہ آخرت میں صبر کرنے والوں کو وہ مراتب حاصل ہوں گے جو دوسروں کو حاصل نہیں

ہوں گے، اور جن لوگوں کو وہ مراتب حاصل نہ ہوں گے وہ یہ خواہش کریں گے کہ کاش! ہماری کھالیں دنیا میں قینچیوں سے چیری جاتیں اور ہم اس پر صبر کرکے ایسے مراتب کے مستحق ہوتے۔ (جامع ترمذی باب ماجاء فی ذھاب البصر جلد۲صفحہ۲۳)

استخارہ کے بعد انجام کار خیر ہی کی طرف ہوتا ہے

آج کے بیان میں صحابی رسول حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ایک ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ بعض اوقات انسان اللہ کے حضور استخارہ کرتا ہے تاکہ وہ کام ہوجائے، تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے بہترین راستہ پسند فرمالیتے ہیں، لیکن ظاہری اعتبار سے اس کی سمجھ میں وہ کام نہیں آتا جس کی وجہ سے وہ اپنے پروردگار پر ناراض ہوتا ہے کہ میں نے تو اچھے راستے کی درخواست کی تھی لیکن ملنے والا راستہ بظاہر اچھا نظر نہیں آرہا کیونکہ اس میں تکلیف اور پریشانی ہے۔ گویا اس کے دل میں اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ناراضگی پیدا ہوتی ہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد انجام سامنے آنے پر معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت اللہ کا فیصلہ ہی اس کیلئے بہتر تھا۔ یہ چیز بعض اوقات دنیا میں ظاہر ہوجاتی ہے جبکہ بعض اوقات آخرت میں اس کا انجام سامنے آتا ہے۔

استخارہ میں خواب آنا ضروری نہیں

استخارہ کے بارے میں لوگوں کے درمیان بڑی غلطیاں پائی جاتی ہیں، مثلاً لوگ سمجھتے ہیں کہ استخارہ کا کوئی خاص طریقہ ہوتا ہے، اس طریقے سے استخارہ کرنے کے بعد ایک خواب نظر آتا ہے جس میں اس کو کام کرنے یا نہ کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے، تو خوب سمجھ لیجیے کہ جو استخارہ آنحضرت ﷺ سے مسنون

طریقے پر ثابت ہے اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بعض اوقات خواب آجاتا ہے اور بعض اوقات نہیں بھی آتا۔

استخارہ کا مسنون طریقہ اور اس کی دعا

استخارہ کا مسنون طریقہ صرف یہ ہے کہ انسان استخارہ کی نیت سے دو رکعتیں پڑھے اور اس میں یہ نیت کرے کہ یا اللہ! میرے سامنے دو راستے ہیں، ان میں سے جو راستہ میرے حق میں بہتر ہو آپ اس کا فیصلہ فرمادیں۔اس کے بعد حضور ﷺ کی متعین فرمودہ مسنون دعا پڑھے۔ یہ ایسی عجیب دعا ہے کہ اگر انسان اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگالیتا تب بھی ایسی دعانہیں لکھ سکتا تھا۔
وہ دعا یہ ہے۔

﴿اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُكَ بِعِلْمِكَ وَاَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِیْمِ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَآ اَقْدِرُ وَ تَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ فَاقْدُرْهُ لِیْ وَیَسِّرْهُ لِیْ ثُمَّ بَارِكْ لِیْ فِیْهِ وَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ فَاصْرِفْهُ عَنِّیْ وَاصْرِفْنِیْ عَنْهُ وَاقْدُرْلِیَ الْخَیْرَ حَیْثُ كَانَ ثُمَّ اَرْضِنِیْ بِهٖ﴾

(رواہ البخاری)

''اے اللہ! میں آپ کے علم کے واسطے سے آپ سے خیر مانگتا ہوں اور آپ کی قدرت کے وسیلے سے قدرت طلب کرتا ہوں اور آپ سے آپ کے بڑے فضل کا سوال کرتا ہوں اس لئے کہ آپ قادر ہیں، میں قادر نہیں ہوں اور آپ جانتے ہیں، میں نہیں جانتا اور آپ غیب کی باتوں کو خوب جانتے ہیں۔ اے اللہ! اگر آپ کے علم میں ہے کہ یہ کام میرے حق میں، میرے دین و دنیا اور انجام کار کے اعتبار سے بہتر ہے تو اسے میرے لیے مقرر فرمادیں اور اس کو آسان کردیں پھر اس میں میرے لیے برکت ڈال دیں، اور اگر آپ جانتے ہیں کہ یہ کام میرے حق میں، میرے دین و دنیا اور انجام کار کے اعتبار سے برا ہے تو اس کو مجھ سے اور مجھے اس سے دور کر دیجیے اور میرے لیے خیر کو مقدر فرمادیں جہاں بھی ہو، پھر مجھے اس پر راضی بھی کر دیجیے'' (بخاری)

دو رکعتیں پڑھنے کے بعد اس دعا کو پڑھ لیا جائے تو مسنون استخارہ ہوگیا۔

استخارہ کا وقت

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ استخارہ صرف سوتے وقت یا عشاء کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ یاد رکھیں کہ جب بھی موقع ملے، اس وقت استخارہ کیا جاسکتا ہے، اس میں دن، رات، سونے اور جاگنے کی کوئی قید نہیں۔

استخارہ کا نتیجہ

استخارہ کے بعد کوئی خواب آنا بھی ضروری نہیں جس میں کسی طرف اشارہ کیا جائے، استخارہ کرنے کے بعد انسان کا رجحان خود بخود ایک چیز کی طرف پیدا ہوجاتا ہے، جس طرف رجحان پیدا ہو اس کام کو کرلے !اور اگر کسی بھی طرف رجحان نہ ہو بلکہ کشمکش برقرار رہے تو استخارہ کا مقصد پھر بھی حاصل ہوجائے گا، اس لیے کہ اس شخص کے استخارہ کے بعد اللہ تعالیٰ اس کیلئے ایسے اسباب مہیا فرمادیتے ہیں جو اس کیلئے بہتر ہوتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات جو انسان کو کوئی کام اچھا ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا، اس کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اے نادان !تو اپنی محدود عقل کے ذریعے اس کام کو اپنے حق میں بہتر نہیں سمجھ رہا ہے، یادرکھ! جس کے علم میں اس وسیع وعریض کائنات کا سارا نظام ہے وہ تیرے حق میں بہتر اور نہ بہتر کو زیادہ جانتا ہے، اور اس نے جو کچھ کیا وہی تیرے حق میں بہتر ہے چاہے دنیا میں انجام معلوم ہو یا آخرت میں۔

یقین رکھئے کہ اللہ تعالیٰ خیر ہی کا فیصلہ فرمائیں گے

اس کی مثال ایسے سمجھئے کہ ایک بچہ اپنے والدین سے کسی چیز کے بارے میں ضد کررہا ہو اور وہ چیز بچے کیلئے مہلک ہو، تو والدین بچے کو وہ چیز نہیں دیتے بلکہ کوئی دوسری چیز دے دیتے ہیں، اب بچہ اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میرے والدین نے میرے ساتھ ظلم کیا ہے کہ جو چیز میں نے مانگی وہ مجھے نہیں دی اور دوسری چیز جو میرے کام کی نہیں وہ مجھے دیدی، گویا اس کو اپنے حق میں اچھا

نہیں سمجھتا۔ لیکن جب بچے کو عقل آئے گی تو اسے معلوم ہوگا کہ میں اپنے لئے موت مانگ رہا تھا اور میرے والدین میری صحت اور زندگی کا راستہ اختیار کر رہے تھے۔ تو جو اللہ اپنے بندوں پر والدین سے بھی زیادہ مہربان ہے، وہ اپنے بندے کیلئے وہی راستہ اختیار کرے گا جو اس بندہ کیلئے فائدہ مند ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور اُسکی قبولیت

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی ؒ نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے جانے لگے تو راستے میں ایک شخص کے پاس سے گزرے، اس شخص نے کہا کہ اے موسیٰ! آپ اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کا شرف حاصل کرنے جارہے ہیں تو میرے حق میں بھی دعا کر دیجیے گا کہ مجھے اپنی زندگی میں بہت مصیبتیں پیش آتی ہیں اور تکلیفوں کا ایک پہاڑ مجھ پر ٹوٹا ہوا ہے، فقر وفاقہ کی مصیبت مظالم میں مزید اضافہ کر رہی ہے، اس لیے آپ اللہ تعالیٰ سے میرے حق میں راحت کی دعا کر دیجیے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اچھا میں دعا کردوں گا۔ چنانچہ جب وہاں پہنچے تو اس شخص کی یاد آئی، عرض کیا اے اللہ! آپ کا فلاں بندہ جو فلاں جگہ رہتا ہے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کے حضور اس کی پریشانیاں عرض کروں، اے اللہ! وہ بھی تو آپ کا بندہ ہے اس لیے اسے بھی راحت عطا فرما دیجیے اور اسے بھی اپنے پاس سے نعمت عطا فرما دیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ اے موسیٰ! اس کو تھوڑی نعمت دوں یا زیادہ؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی یا اللہ! جب

اس کو نعمت دینی ہے تو تھوڑی کیوں دیں؟ آپ اس کو زیادہ ہی عنایت کیجئے! اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا تم مطمئن رہو ہم نے اس کو زیادہ دیدیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مطمئن ہوگئے، اس کے بعد جب وہ واپس آنے لگے تو ان کے دل میں خیال آیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو راحت اور عافیت دے ہی دی ہے تو اب دیکھنا چاہئے کہ وہ کس حال میں ہے؟ چنانچہ اس ارادہ سے جب اس کے گھر جاکر دروازے پر دستک دی تو کوئی دوسرا شخص باہر نکلا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہاں جو فلاں شخص رہتا تھا میں اس سے ملنا چاہتا ہوں، اس آدمی نے کہا کہ اس کو تو مرے ہوئے کئی دن گزر گئے، تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ جس لمحے انہوں نے اس شخص کیلئے دعا کی تھی اس کے کچھ ہی دیر بعد اس کا انتقال ہوگیا تھا۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے پریشان ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ یا اللہ! میں نے تو اس کیلئے راحت اور عافیت کی چیز مانگی تھی اور آپ نے اسے زندگی ہی سے محروم کردیا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہم نے تم سے پوچھا کہ اے موسیٰ! اس کو تھوڑی نعمت دیں یا زیادہ؟ تو تم نے کہا تھا کہ زیادہ دیجیے! پس اگر میں اس کو دنیا کی ساری نعمتیں بھی دیدیتا تو وہ تھوڑی ہوتیں، لیکن اب جو نعمتیں میں نے اس کو عطا کی ہیں ان پر زیادہ والی بات واقعتہ صادق آتی ہے اس لیے میں نے اسے موت دیکر آخرت کی نعمتیں عطاء کردیں۔

حاصل یہ کہ انسان اپنی محدود عقل کے ذریعے اللہ کی حکمتوں کا ادراک نہیں کرسکتا، اور اپنی ظاہری کیفیت کو دیکھ کر شکوہ شکایت کرنے لگتا ہے۔ اسی لئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ استخارہ کرنے کے بعد مطمئن ہوجاؤ کہ اللہ تعالیٰ

خیر ہی کا فیصلہ فرمائیں گے۔ چاہے وہ فیصلہ ظاہر میں تمہیں اچھا نظر نہ آرہا ہو، لیکن انجام کے اعتبار سے وہی بہتر ہوگا۔

استخارہ کرنے والا کبھی ناکام نہیں ہوتا

اس لیے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا

﴿مَاخَابَ مَنِ اسْتَخَارَوَلَانَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ﴾

"اپنے معاملات میں استخارہ کرنے والا کبھی ناکام نہیں ہوگا، اور مشورہ سے کام کرنے والا پشیمان نہیں ہوگا"

(مجمع الزوائد جلد ۸)

یعنی جو شخص استخارہ کرکے اپنے معاملات کا حل کرتا ہے وہ شخص کامیاب ہی ہوتا ہے، اگرچہ اس کے دل میں اس کام کے اچھا نہ ہونے کا خیال بھی آجائے۔ اور جو شخص مشورہ سے کام کرے گا، وہ پچھتائے گا نہیں اس لیے کہ اگر بالفرض اس کے سامنے برائی آگئی تو کم ازکم اس کو یہ تو تسلی ہوگی کہ میں نے یہ کام خودرائی اور اپنے بل بوتے پر نہیں کیا بلکہ اپنے اہل محبت کے مشورہ سے کیا ہے۔ اب آگے اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسا چاہیں فیصلہ فرمائیں۔ گویا حدیث میں دو باتوں کا مشورہ دیا گیا ہے کہ جب بھی کسی کام میں کشمکش ہوتو دو کام کرلیا کرو، ایک استخارہ اور دوسرا استشارہ یعنی مشورہ۔

استخارہ کا ایک اور طریقہ اور چند مختصر دعائیں

یہ جو استخارہ کا مسنون طریقہ عرض کیا گیا ہے، اس وقت ہے جب

انسان کو استخارہ کرنے کی مہلت اور موقع ہو، تو دو رکعات پڑھ کر استخارہ کرے، لیکن بسا اوقات انسان کو اتنی جلدی فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس میں دو رکعت پڑھ کر استخارہ کرنے کا وقت ہی باقی نہیں رہتا، کیونکہ بعض اوقات اچانک کوئی کام سامنے آجاتا ہے اور فوراً اس کے بارے میں فیصلہ کرنا پڑتا ہے، تو اس وقت کی بھی دعائیں خود نبی کریم ﷺ نے تلقین فرمائی ہیں، جو یہ ہیں۔

﴿اَللّٰھُمَّ خِرْلِیْ وَاخْتَرْلِیْ﴾

''اے اللہ! میرے لیے آپ ہی پسند فرمایئے (کہ مجھے کونسا راستہ اختیار کرنا ہے)''

(کنز العمال ج ۷ حدیث ۱۸,۵۳)

اس کے علاوہ ایک اور دعا آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تلقین فرمائی ہے۔

﴿اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ وَسَدِّدْنِیْ﴾

''اے اللہ! میری صحیح ہدایت فرمایئے اور مجھے سیدھے راستے پر رکھیئے'' (رواہ مسلم)

اسی طرح یہ دعاء بھی آپ ﷺ سے منقول ہے۔

﴿اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنِیْ رُشْدِیْ﴾

''اے اللہ! صحیح راستہ میرے دل میں عطاء فرمادیجئے''

(رواہ الترمذی)

ان دعاؤں میں سے کوئی بھی دعا پڑھی جاسکتی ہے۔ اور اگر عربی الفاظ یاد نہ رہیں تو اردو میں دعا کرلیں کہ یا اللہ! مجھے اس کشمکش میں صحیح راستہ دکھا دیجیے۔ اور

اگر زبان سے دعا نہ کرسکیں تو دل میں دعا کرلیں۔

حضرت والد صاحبؒ کا استخارہ کے بارے میں طرز عمل

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کو ساری عمر یہ اہتمام کرتے دیکھا کہ جہاں کوئی فیصلہ کرنے والا معاملہ پیش آتا، انہوں نے چند لمحوں کیلئے آنکھیں بند کرلیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس امر کے بارے میں رجوع کرلیا۔ اب جو شخص آپ کی عادت سے واقف نہیں ہوتا، اس کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ آنکھیں بند کرکے کیا کام ہورہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ آنکھیں بند کرکے اللہ تعالیٰ سے رجوع کرلیتے تھے اور دعاء کرلیتے تھے۔ اس طرح وہ دل ہی دل میں ایک استخارہ کرلیتے تھے جس کی وجہ سے اس کام کے بارے میں بھی علم ہوجاتا اور دعا کا اجروثواب بھی مل جاتا تھا۔

استخارے کی وجہ سے اللہ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوجاتا ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹرعبدالحی عارفیؒ فرماتے تھے کہ اپنے اللہ سے باتیں کیا کرو کہ جہاں کوئی واقعہ پیش آیا تواللہ تعالیٰ سے مدد مانگو، اس کی طرف رجوع کرکے ہدایت طلب کرو اور اس چیز کی عادت ڈالو کیونکہ رفتہ رفتہ یہی چیز اللہ کیساتھ تعلق کو اتنا مضبوط کردیتی ہے کہ ہر وقت اللہ کا خیال دل میں رہتا ہے۔ لہٰذا جب بھی کوئی کام کرنا ہوتو اس کے شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے رجوع کرلیا جائے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کام میں مدد فرماتے ہیں۔ کیونکہ جب بندہ کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے دل میں اللہ تعالیٰ سے بھلائی چاہتا ہے تو نہ صرف

اللہ تعالیٰ اس کام میں برکت عطاء فرماتے ہیں بلکہ اس بندہ کے ساتھ بھی ایک مضبوط تعلق قائم ہوجاتا ہے۔

رجوع الی اللہ کے مواقع

آپ غور کریں! صبح سے شام تک نہ جانے کتنے مواقع ایسے میسر آتے ہیں جن میں کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کوئی چیز خریدنے یا نہ خریدنے کے بارے میں، کبھی کہیں جانے یا نہ جانے کے بارے میں، اور کبھی کوئی گھریلو معاملہ حل کرنے کے بارے میں، اگر بندہ ان مواقع پر اپنے رب سے لولگا کر مدد طلب کرے اور دل میں یہ دعاء کرے کہ یارب! میرے دل میں وہ بات ڈال دیجئے جو آپ کی رضاء کے مطابق ہو، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس شخص کی طرف متوجہ ہوجاتی ہے۔ اور پھر اس کے فیصلہ میں بھی برکت ہوتی ہے۔

حضرت تھانویؒ کا معمول

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے پاس جب بھی کوئی شخص آکر کہتا ہے کہ
حضرت! آپ سے ایک بات پوچھنی ہے، تو میرا معمول ہے کہ میں اس وقت فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ یااللہ! معلوم نہیں یہ شخص کیا بات مجھ سے پوچھے گا؟ آپ اپنے فضل وکرم سے اس کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دیجیے! اور کبھی بھی اس رجوع کرنے کو ترک نہیں کرتا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو رجوع الی اللہ کی توفیق عطاء فرمائے اور سنت کے مطابق استخارہ کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

توکل کی حقیقت

موضوع	■	توکل کی حقیقت
بیان	■	جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ
ضبط و ترتیب	■	محمد ناظم اشرف (فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی)
مقام	■	جامع مسجد بیت المکرم
باہتمام	■	محمد ناظم اشرف
ناشر	■	بیت العلوم ۔ ۲۰ نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی، لاہور
		فون: ۷۳۵۲۴۸۳

﴿توکل کی حقیقت﴾

بعد از خطبہ:

عن سعید بن المسیبؒ ان سلمان و عبداللّٰہ بن سلام رضی اللّٰہ عنہما التقیا فقال احدھما لصاحبہ ان لقیت ربك قبلی .... واعلمنی مالقیت و ان لقیتہ قبلك لقیتك و اخبرتك فتوفی احدھما ولقی صاحبہ فی المنام فقال لہ توکل وَاَبْشِرُ فَاِنِّیْ لم ارمثل التوکل قال ذالك ثلث مِرَ ارًا۔

دوصحابیوں کا ایک معاہدہ:

یہ ایک واقعہ ہے جو حضرت سعید بن المسیبؒ نے بیان فرمایا ہے۔ حضرت سعید بن المسیبؒ اونچے درجے کے تابعین، اولیاء کرام اور محدثین میں سے ہیں اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے خاص شاگرد ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت سلمان

فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ آپس میں ملے، یہ دونوں صحابی پہلے اہل کتاب میں سے تھے۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسیؓ پہلے تو نصرانی رہے پھر یہودیت بھی انہوں نے اختیار کی اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی توفیق عطا فرمائی۔ اور حضرت عبداللہ بن سلام پہلے یہودی تھے، یہود کے سردار مانے جاتے تھے اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کی توفیق عطا فرما دی۔ اب ان دونوں بزرگوں نے اپنی اس ملاقات میں ایک دوسرے سے ایک معاہدہ کیا کہ ایک نے دوسرے سے کہا کہ اگر تمہارا انتقال پہلے ہو جائے تو تم مجھے خواب میں آکر بتانا کہ تمہارے ساتھ کیا گزری اور اگر میرا انتقال پہلے ہو گیا تو میں تمہیں خواب میں آکر بتاؤں گا کہ میرے ساتھ کیا گذری اور کیا حالات وہاں پر دیکھنے میں آئے؟

اللہ تعالیٰ لاج رکھتے ہیں:

ویسے تو یہ انسان کے اختیار میں نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے دوسرے کے خواب میں آجائے لیکن اللہ کے کچھ نیک بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ اللہ کے بھروسے پر کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی لاج رکھتے ہوئے ان کی بات کو سچا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿رب اشعث اغبر مدفوع بالابواب لواقسم على الله لابره﴾

"بعض لوگ بظاہر بڑے پراگندہ حال و بال ہوتے ہیں اور لوگ ان کو اپنے دروازوں سے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں۔

اگر وہ اللہ کے بھروسے پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دیتے ہیں"۔ (رواہ مسلم جلد ۴ صفحہ ۲۰۲۴ باب فضل الضعفاء والخاملین)

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے خواہ ایسی بات کی قسم کھائیں جو ان کے اختیار میں نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کی خاطر اتنی عزیز ہوتی ہے کہ ان کی زبان سے نکلی ہوئی بات اللہ تعالیٰ پوری کر دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے یہ حدیث اس وقت ارشاد فرمائی تھی جب کہ دو عورتوں کا آپس میں جھگڑا ہو گیا اور ان میں سے ایک نے دوسری کا دانت توڑ دیا۔ یہ مقدمہ نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش کیا گیا۔ چونکہ اس وقت تک قصاص کا قانون نازل ہو چکا تھا اس لیے حضور ﷺ نے قصاص کا فیصلہ سنا دیا۔ اب وہ عورت کہ جس سے دانت کا قصاص لینا تھا ان کے ایک عزیز جو کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا بھی تھے، موجود تھے کہ اچانک ان کے منہ سے نکلا۔

﴿لا واللہ لا تکسر ثنیتها یارسول اللہ ﷺ﴾

"یارسول اللہ! میں قسم کھاتا ہوں کہ اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا"۔

اب اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس مظلوم خاتون نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگرچہ مجھے اس کا دانت توڑنے کا حق حاصل ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ اختیار بھی تو دیا ہے کہ میں اس کو معاف کر دوں۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں مجھے اسی کے بدلے معاف فرما دیں۔ یوں اس عورت کا دانت ٹوٹنے سے بچ گیا۔ اس موقع پر آنحضور ﷺ نے مذکورہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔

آخرت کے حالات مزید معلوم نہیں ہو سکتے

خیر! ان دونوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک کا انتقال پہلے ہو گیا تو دوسرے کو اسی بات کا انتظار رہا کہ وہ خواب میں آکر انہیں وہاں کے حالات بتائیں۔ چنانچہ وہ خواب میں آگئے، اب ان کو یہ خیال تھا کہ یہ وہاں کے حالات اور کیفیات کے بارے میں بتلائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو ایسا پردۂ راز میں رکھا ہے کہ کسی کو بھی اس کی خبر کسی طریقے سے نہیں ہو پاتی۔ بس جو علم اللہ تعالیٰ نے دے دیا اور سرور کائنات ﷺ نے جو کچھ بتلا دیا اس سے آگے جانے کی کسی میں مجال ہی نہیں ہے۔

یہاں کے حالات دیکھنے کے ہیں، بتانے کے نہیں

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے ایک واقعہ سنا کہ ایک بزرگ سے کسی نے کہا کہ ہم جو مرنے کے بعد کے حالات پڑھتے ہیں تو محض تصور سے تو اس کی تفصیل سمجھ میں نہیں آسکتی، اس لیے آپ کوئی ایسی ترکیب بتائیے کہ جس کے ذریعے ہمیں تمام تفصیلات اچھی طرح معلوم ہو جائیں۔ ان بزرگ نے کہا اچھا! میں تمہیں بتانے کی کوشش کروں گا۔ تم ایسا کرنا کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میرے دفن کے وقت میرے ساتھ ایک قلم اور کاغذ رکھ دینا اور دفن کے کچھ دن بعد تم میری قبر پر آنا تو وہاں پر تمہیں ایک پرچہ رکھا ہوا ملے گا جس میں وہاں کے حالات لکھے ہوں گے۔ اس شخص نے ایسا ہی کیا اور کچھ دن کے بعد جب وہ ان کی قبر پر پہنچا تو واقعتہً وہاں ایک پرچہ پڑا ہوا پایا، اب یہ شخص بڑی خوشی اور شوق سے آگے بڑھا کہ اس کے ذریعے مجھے وہاں کے حالات معلوم ہوں گے لیکن جب

اس نے پرچہ اٹھا کر دیکھا تو اس میں یہ لکھا ہوا پایا کہ یہاں کے حالات دیکھنے کے ہیں بتانے کے نہیں۔ اور اسی عالم کے حالات کو مخفی رکھنے میں بھی حکمت ہے کہ اگر کسی وقت عالم برزخ کے مناظر سامنے آ جائیں تو کوئی انسان بھی دنیا کا کوئی کام کر ہی نہ سکے۔ اسی لیے روایات میں آتا ہے کہ قبر میں جب عذاب ہوتا ہے تو بعض اوقات جانور بھی اس کی آواز سن لیتے ہیں لیکن انسان کو وہ آواز نہیں سنائی دیتی کیونکہ اگر انسان وہ آواز سن لے تو پھر وہ دنیا کے کام نہیں کر سکے گا۔

عالم برزخ میں توکل کی اہمیت :

بہرحال! جو صحابی خواب میں آئے انہوں نے انہیں وہاں کے حالات تو نہ بتائے البتہ ایک ایسا جملہ بتا گئے جو ہمارے اور آپ کے عمل سے تعلق رکھتا ہے انہوں نے فرمایا کہ میں یہاں آنے کے بعد جس چیز کو شدت سے محسوس کر رہا ہوں وہ توکل ہے۔ اگر تم نے اللہ پر بھروسہ کر لیا تو پھر خوشخبری سن لو کہ اس کا انجام بہت بہتر ہے اس لیے کہ اس جہان میں آنے کے بعد میں نے توکل کے علاوہ کسی اور صفت کو نہیں دیکھا جو انسان کے درجات کو بلند کر دے۔

توکل کا معنی :

توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاحی معنی اللہ پر بھروسہ کرنے کے ہیں۔ یعنی اس کائنات میں ہونے والے تمام افعال اللہ تعالیٰ کی مشیت، قدرت اور اس کی حکمت سے ہو رہے ہیں۔ اور توکل درحقیقت توحید ہی کا ایک لازمی حصہ ہے کیونکہ توحید صرف کلمہ طیبہ زبان سے پڑھ لینے کا نام نہیں ہے بلکہ توحید کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ چنانچہ جب "لا الہ الا اللہ" کہا تو اس کا لازمی

تقاضا یہ ہے کہ اس کائنات میں نہ کوئی عبادت کے لائق اور نہ کوئی محبت کے لائق، اس کائنات میں نہ کسی کے پاس قدرت اور نہ وسعت، اس کائنات کے اندر ہونے والے تمام تصرفات اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہو رہے ہیں۔ کسی بزرگ کا مقولہ ہے کہ "توحید خدا، خدارا واحد دیدن است نہ کہ واحد گفتن" یعنی درحقیقت توحید اللہ تعالیٰ کو ایک دیکھنے کا نام ہے نہ کہ ایک کہنے کا۔ مطلب یہ کہ فقط زبان سے ایک کہہ دینا کافی نہیں بلکہ اللہ کی دی ہوئی آنکھ سے دیکھے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہو رہا ہے، اسی کو توحید کہا جاتا ہے اور اسی کا ایک لازمی تقاضا توکل بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ اسباب پیدا کر رکھے ہیں لیکن وہ اسباب فی نفسہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے، ان اسباب میں قوت پیدا کرنے والی ذات اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ہے، اسی کو توکل کہا جاتا ہے۔ اب توکل کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا نہ کہ اسباب و ذرائع پر۔ اگرچہ اسباب اختیار کرنے کا ہمیں شریعت ہی نے حکم دیا ہے لیکن انسان اسباب کو اختیار کرتے ہوئے یہ سوچ لے کہ اس کی اپنی ذات میں کچھ نہیں رکھا بلکہ اس میں قوت دینے والی ذات کوئی اور ہے لہٰذا اصل رجوع مجھے اسی کی طرف کرنا چاہئے۔

توکل کا صحیح مفہوم:

مثال کے طور پر کسی شخص کو بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ اب بیماری کا علاج کرنا تو نبی کریم ﷺ کی سنت بھی ہے لیکن ایک مسلمان کے دوا کھانے میں ایک کافر کے ساتھ امتیاز ہونا چاہئے۔ کیونکہ کافر جو کہ خدا پر ایمان نہیں رکھتا اس کا سارا بھروسہ اس دوا پر ہے۔ لیکن ایک مسلمان جب دوا کھاتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ یہ دوا کوئی حقیقت نہیں رکھتی، اس دوا کے اندر تاثیر پیدا کرنے والی کوئی اور ذات ہے

اور اسی کو ''توکل'' کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگرچہ یہ اعتقاد ایک مسلمان کے دل میں ہوتا ہے مگر عمل کے وقت اس کا دھیان نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر عمل کے وقت دھیان ہوگا تب جا کر توکل کا صحیح مفہوم حاصل ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس بات کا مشاہدہ بھی کراتے رہتے ہیں کہ اسباب انسان کو دھوکہ دے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک دوا کسی بیماری میں بڑی موثر ثابت ہوئی لیکن دوسری مرتبہ اسی مرض میں وہی دوا کھانے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

دوا بھی تاثیر کی اجازت طلب کرتی ہے:

ہمارے ایک بزرگ ڈاکٹر صغیر احمد ہاشمی صاحب تھے جو کہ حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ کے خاص معالج اور بڑے تجربہ کار ڈاکٹر تھے۔ ایک دن میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری ساری عمر کا تجربہ یہ ہے کہ دوا جب مریض کے حلق میں جاتی ہے تو (اللہ تعالیٰ سے) پوچھتی ہے کہ کیا اثر کروں؟ فائدہ یا نقصان؟ پھر جو اشارہ وہاں سے ملتا ہے اس کے مطابق وہ دوا کام کرتی ہے۔ یہی بزرگ ہمیں سناتے تھے کہ کسی وقت میں لاہور کے گنگارام ہسپتال کا انچارج ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں رات کے وقت ہسپتال میں گیا تو وہاں میں نے واپسی کے وقت موجود عملے سے کہا کہ جو چھ نمبر بیڈ کا مریض ہے اس پر میں ساری تدبیریں اختیار کر چکا، اب اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں بس یہ ایک دو گھنٹے کا مہمان ہے۔ جب اس کا انتقال ہو جائے تو اس کے ورثاء کو اس کی اطلاع کر دینا، اور وہ جو ۱۲ نمبر بیڈ کا مریض ہے وہ اب تندرست ہو چکا ہے، صبح کو تم اسے چھٹی دے دینا کیونکہ مجھے صبح آنے میں دیر ہو جائے گی۔ اس کے بعد جب میں اگلے دن وہاں پر گیا تو معلوم ہوا کہ چھ نمبر بیڈ والا مریض تو صحت یاب ہو کر اپنے گھر کو روانہ ہو

چکا ہے اور ۱۲ نمبر بیڈ کا مریض فوت ہو چکا ہے۔ معلوم ہوا کہ دوا اپنا اثر دکھانے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے اجازت لیتی ہے پھر اپنا اثر دکھاتی ہے۔

توکّل اس چیز کا نام نہیں :

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ توکل اس چیز کا نام ہے کہ انسان تدبیر کیے بغیر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ توکل اس کا نام ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں اپنی اونٹنیوں کو چرانے جاتا ہوں تو نماز کے وقت ان اونٹنیوں کو باندھ دیا کروں یا کھلا رہنے دیا کروں اور اللہ پر توکل کر لوں؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے اس کی پنڈلی کو رسی سے باندھو پھر توکل کرو یعنی اسباب اختیار کرنے کے بعد توکل کرو۔

ہماری مثال :

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ بطور تمثیل سنایا کرتے تھے کہ ایک دیہاتی ہندو تھا۔ جس زمانے میں ہندوستان کے اندر نئی نئی ریل چلی تو اس نے دیکھا کہ سارا کا سارا شہر خود بخود بھاگا چلا جا رہا ہے، اسے بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیا بات ہے؟ اس نے حیرانی سے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیسے خود بخود چل رہی ہے۔ تو کسی نے کہا کہ بھئی! یہ گاڑی خود سے نہیں چل رہی بلکہ درحقیقت گارڈ جب سبز جھنڈی ہلاتا ہے تو اس وقت ریل چلتی ہے، اس لیے اصل تو گاڑی چلانے والی سبز جھنڈی ہے۔ اس نے یہ سنکر سبز جھنڈی کو بڑا معزز سمجھا اور جا کر اس کی تعظیم کرنے لگا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ یہ سبز جھنڈی بڑی

طاقتور ہے کہ اتنی بڑی ریل کو چلا رہی ہے۔لوگوں نے اس سے کہا درحقیقت یہ گارڈ کے ایک ہاتھ کا کمال ہے جس میں اس نے یہ جھنڈی اٹھائی ہوئی ہے۔ اس لیے اصل وہ گارڈ ہے، سبز جھنڈی کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ اس نے گارڈ کے پاس جا کر اس کی تعریف شروع کر دی کہ آپ تو بہت طاقتور آدمی ہیں کیونکہ آپ ہی کی بدولت یہ پوری گاڑی چلتی ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو اتنا طاقتور آدمی نہیں ہوں کہ اس گاڑی کو چلا سکوں اصل تو ڈرائیور ہے جو سب سے آگے بیٹھا ہے، وہ گاڑی چلاتا ہے۔ پھر وہ شخص ڈرائیور کے پاس پہنچ کر اس کو کہتا ہے تم تو بڑے طاقتور ہو کہ اتنی بڑی گاڑی چلا رہے ہو۔ اس نے کہا کہ بھئی! میں تو کوئی طاقتور آدمی نہیں بس یہ چند پرزے ہلاتا ہوں اس سے یہ گاڑی چلتی ہے اور یہ پرزے بھی خود کچھ نہیں بلکہ ان کے پیچھے بھاپ کی طاقت ہے جو اسے چلاتی ہے۔ اب یہ دیہاتی بے چارہ اس مقام پر پہنچ کر رک گیا کہ اس کو کون چلاتا ہوگا؟ لیکن اگر غور وفکر کی نظر ہوتی تو سمجھ لیتا کہ بھاپ میں بھی کوئی طاقت نہیں، اس میں طاقت پیدا کرنے والی بھی کوئی اور ہستی ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ اس دیہاتی کی طرح کبھی سبز جھنڈی پر بھروسہ کر لیا کبھی گارڈ پر، کبھی ڈرائیور پر اور کبھی بھاپ پر، اور اس سے آگے جو سب سے بڑی طاقت ہے اس کی طرف دھیان نہیں جاتا جس کی وجہ سے توکل سے محروم رہ جاتے ہیں۔ توکل یہ ہے کہ انسان ہر چیز میں یہ نظریہ رکھے کہ اس کام میں کچھ بھی نہیں رکھا، حقیقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ ہی اس کام کو کر رہے ہیں۔

اور اس بات کا استحضار کرنے کے لیے شریعت نے کچھ احکام دیئے ہیں مثلاً قرآن کریم میں فرمایا:۔

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ

اللّٰہُ﴾ (الکہف: ۲۳)

''کبھی بھی کسی کام کے بارے میں یہ نہ کہو کہ میں یہ کل کر دوں گا بلکہ ساتھ یہ کہو انشاء اللہ یہ کام کروں گا''۔

انشاء اللہ کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ کا حکم اور اس کی مشیت ہوئی تو میں فلاں کام کروں گا۔

آج لوگوں نے انشاء اللہ کا معنی ہی بگاڑ کر رکھ دیا اور یہ سمجھ لیا کہ انشاء اللہ کہنے سے کچا ارادہ مراد ہوتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت انشاء اللہ کا مقصود یہ ہے کہ دل میں اس بات کا استحضار پیدا کیا جائے کہ کوئی کام بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

ایک قصہ

حضرت تھانویؒ نے اپنے کسی وعظ میں ایک لطیفہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب راستے میں چلتے ہوئے اپنے کسی دوست سے ملے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ بکری خریدنے جا رہا ہوں! اس نے کہا کہ جب کوئی کام کرنے کا ارادہ ہو تو انشاء اللہ کہہ لیا کرو۔ انہوں نے کہا انشاء اللہ کا کیا مقصد؟ پیسے میری جیب میں ہیں، بکری بازار میں ہے، جاؤں گا اور بکری خرید کر لے آؤں گا۔ اور یہ کہہ کر چل دیے۔ اب جب آگے چلے تو راستے میں جیب کٹ گئی جس کی وجہ سے وہ بکری نہ خرید سکے۔ چنانچہ واپسی کے ارادے سے روانہ ہوئے تو راستے میں وہی صاحب پھر مل گئے۔ انہوں نے پوچھا کیا ہوا تو کہا کہ میں انشاء اللہ بکری خریدنے گیا تھا تو انشاء اللہ میری جیب کٹ گئی اور انشاء اللہ

میں بکری نہیں خرید سکا۔

غرضیکہ توکل کی تعلیم درحقیقت اس لیے دی گئی ہے کہ انسان کو یہ استحضار رہے کہ میں کوئی بھی کام اللہ کی مرضی کے بغیر نہیں کرسکتا اور یہ چیز انشاء اللہ کہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی کی وجہ سے پھر انسان کی نظر اسباب سے ہٹ کر مسبب کی طرف چلی جاتی ہے۔ آپ ذرا اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ بیماری ہوتی ہے تو سارا زور سبب یعنی دوا پر ہوتا ہے۔ لیکن اس دوا کے اندر تاثیر پیدا کرنے والے کی طرف رجوع ہر ایک کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب بھی دوا کھائیں تو یہ نیت کرلیا کیجئے کہ یا اللہ! یہ دوا تو کھا رہا ہوں آپ اس میں تاثیر بھی ڈال دیجئے تو توکل پر عمل ہو جائے گا۔ اسی طرح تجارت وغیرہ کے اندر بھی یہی حکم ہے۔

بعض بزرگوں کا طریقہ توکل

اس مقام پر تھوڑی سی تفصیل مزید عرض کر دوں کہ جس کے بارے میں ذہنوں میں اکثر خلجان رہتا ہے۔ بعض بزرگوں نے توکل کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ انہوں نے معاش کا کوئی کام کیا ہی نہیں، مثلاً اپنے گھر یا جنگل میں بیٹھ گئے اور کوئی کام نہیں کیا جس سے کبھی فاقہ کی نوبت بھی آئی اور کبھی اللہ نے عطا بھی فرما دیا اور خود حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں بعض صحابہ کرامؓ کا بھی یہ حال تھا۔ مثلاً اصحاب صفہ حضور ﷺ سے علم حاصل کرنے کی خاطر صفہ پر آ کر پڑ گئے تھے اور مقصد صرف قال اللہ و قال الرسول کی تعلیم حاصل کرنا تھا۔ اب ظاہری طور پر ان کے معاش کی کوئی صورت نہ تھی اور وہ صفہ پر اس ارادے سے آئے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دیا تو کھالیں گے ورنہ صبر کرلیں گے۔ بلکہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس دو بھائی آیا کرتے تھے۔ ایک بھائی برسر روزگار اور

ہنر مند اور محنت مزدوری کے ذریعے کمانے والا تھا اور دوسرا بھائی اکثر حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھا احادیث سنتا رہتا تھا، تو اس برسر روزگار بھائی نے ایک مرتبہ حضور ﷺ سے اپنے بھائی کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ یارسول اللہ! میرا یہ بھائی کوئی کام نہیں کرتا، ہر وقت آپ ہی کے پاس بیٹھا رہتا ہے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿لعلك ترزق به﴾

''کہ اس پر اعتراض نہ کرو کیا خبر؟ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اسی کی وجہ سے رزق عطا فرما رہے ہوں''۔(رواہ الترمذی)

یعنی حضور ﷺ نے اس توکل پر نکیر نہیں فرمائی اور اسی طرح یہ سلسلہ اولیاء کرام اور صوفیاء عظام تک منتقل ہوتا رہا۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک مرتبہ انہیں کئی وقت کا فاقہ ہو گیا۔ ایک آدمی نے آکر کھانے کے بارے میں عرض کیا تو فرمایا کہ ہاں! دیگیں چڑھ رہی ہیں یعنی یہاں فاقے کر لو اور جنت میں مزے لے لو۔ اسی لیے بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ ایک طرف تو کسب معاش کے لیے تدابیر اختیار کرنیکے بعد توکل کا حکم ہے اور دوسری طرف بعض بزرگوں کا یہ معمول ہے۔

اسباب کی تین قسمیں

تو خوب یاد رکھئے! کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کا ہر کام سبب سے وابستہ کر رکھا ہے لیکن اسباب کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

ایسے اسباب ترک کرنا حرام

۱۔ وہ اسباب کہ جن سے عادۃً نتیجہ مرتب ہو جاتا ہے مثلاً انسان کو

بھوک لگے تو کھانا بھوک مٹانے کا سبب ہے اور کھانا ایسا سبب ہے کہ جس پر نتیجے کا مرتب ہو جانا تقریباً یقینی ہے۔ چنانچہ آج تک سوائے کسی غیر معمولی شخص کے کسی کے بارے میں یہ نہیں سنا گیا کہ اس نے کھانا کھایا لیکن اس کی بھوک نہ مٹی، ایسے اسباب کو ترک کرنا حرام ہے۔ یعنی اگر کسی شخص کے سامنے کھانا موجود ہو اور وہ کہے کہ میں اللہ پر توکل کرتا ہوں کہ وہ میری بھوک مٹا دے گا اور اس کھانے کو نہیں کھاتا تو یاد رکھیں کہ اگر وہ شخص اسی حالت میں مر گیا تو وہ حرام موت مرے گا، کیونکہ سبب یعنی کھانا. کھانے کو اختیار کرنا فرض اور واجب ہے۔ نیز بزرگان دین میں سے کسی ایک سے بھی اس سبب کو ترک کرنا منقول نہیں۔

ایسے اسباب کو ترک کرنا ناجائز

۲۔ اسباب کی دوسری قسم وہ اسباب ہیں جن پر کبھی تو نتیجہ مرتب ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں جیسے دوا کی مثال ہے کہ وہ کبھی فائدہ دیتی ہے اور کبھی نہیں، ان کو "ظنی اسباب" کہا جاتا ہے اور ان کا حکم یہ ہے کہ ہم جیسے کمزور لوگوں کے لیے ایسے اسباب کو بھی ترک کرنا جائز نہیں، ان اسباب کو اختیار کرنے کے بعد پھر اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ساتھ خصوصی تعلق عطا فرمایا ہے ان کے لیے اسباب کو ترک کرنا بھی جائز ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ سے کسی حال میں بھی شکوہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ پر قوی ایمان رکھنے والے لوگ بعض اوقات اس قسم کے اسباب ترک کر دیتے ہیں کہ اگر کھانا وغیرہ موجود ہے تو اس کو ترک نہ کیا لیکن روزگار کے حصول کے معاملے میں توکل کیا چنانچہ خود حضور ﷺ نے، بعض صحابہ نے اور بہت سے بزرگان دین نے بھی ایسا کیا۔ اگر کسی میں قوت برداشت ہو تو ایسا کرنا بھی جائز ہے لیکن یہ ہم جیسے کمزوروں کے لیے نہیں کیونکہ ہم

میں قوت نہیں۔ اگر کوئی نقل بھی اتارنا چاہے تو مارا جائے گا۔ لہٰذا اس میں نقل بھی کرنی مناسب نہیں ہے۔

توکل پر ایک واقعہ

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک صاحب نے یہ بات سنی کہ اللہ کے بعض قوی بندے اللہ پر توکل کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ان کو نوازتے ضرور ہیں۔ اگرچہ کچھ دیر سویر ہو جائے لیکن پھر بھی وہ فراخی سے زندگی گزارتے ہیں۔ چنانچہ ان صاحب نے بھی یہ کام کرنے کا ارادہ کیا اور جنگل میں جا کر بیٹھ گئے۔ اب ایک دن، دو دن، حتیٰ کہ تین دن گذر گئے اور فاقے پر فاقے ہو رہے ہیں اور کوئی بھی نہیں آ رہا، تو طرح طرح کے خیالات دل میں پیدا ہونے لگے، لیکن جب تیسرا دن گذر گیا تو دیکھا کہ ایک صاحب خوان لیے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی جان میں جان آئی کہ اب کام بن گیا لیکن اس شخص نے وہاں پہنچ کر یہ کیا کہ پیٹھ پھیر کر بیٹھ کر خود کھانے لگا، اب یہ تو سمجھے تھے کہ میرے لیے آ رہا ہے اور اس نے خود کھانا شروع کر دیا تو تھوڑی دیر تک تو وہ دیکھتے رہے لیکن پھر رہا نہ گیا اور پیٹھ پھیر کر کھنکھارنا شروع کیا تاکہ اسے اپنی موجودگی کا احساس دلا سکیں۔ چنانچہ اس نے مڑ کر جب انہیں دیکھا تو کہا آیئے آپ بھی شریک ہو جایئے لہٰذا یہ بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ بعد میں ان صاحب کی کسی سے ملاقات ہوئی تو ان سے کہنے لگے کہ ہم نے تو یہ سنا تھا کہ توکل میں اللہ تعالیٰ کہیں نہ کہیں سے انتظام کر ہی دیتے ہیں تو میرا تجربہ یہ ہے کہ ایسا ہو تو جاتا ہے لیکن کچھ کھنکھارنا پڑتا ہے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ایسے توکل سے تو ہزار درجہ بہتر ہے کہ انسان محنت مزدوری کر کے کما کر کھائے اور جس

توکل میں کھنکھارنا پڑے اس توکل سے اللہ کی پناہ!

لہٰذا ہم جیسے کمزورلوگوں کے لیے یہ راستہ نہیں ہے بلکہ ہمارے لیے راستہ یہی ہے کہ ہم اسباب اختیار کریں، لیکن اس پر مکمل بھروسہ ہونے کے بجائے اللہ کی ذات پر ہو۔ جن کو نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں یوں تعبیر فرمایا:

﴿اجملوا فی الطلب و توکلوا علیہ﴾

''اعتدال کے ساتھ کسی چیز کی جستجو کرو اور اللہ پر بھروسہ کرو''۔

(مشکوٰۃ ج ۲ صفحہ۴۵۲)

ایسے اسباب توکل کے منافی ہیں

۳۔ اسباب کی تیسری قسم وہمی قسم کے اسباب ہیں، یعنی انسان اس چکر میں پڑا رہے کہ فلاں زمین خریدوں گا پھر اس کو بیچ کر فلاں جاگیر خریدوں گا اور پھر اس سے فلاں چیز خریدوں گا، یعنی ہر وقت خیالی منصوبے بناتا رہے تو یہ توکل کے منافی ہے۔ لہٰذا چاہئے کہ کسی چیز کی جستجو میں اعتدال ہو لیکن اس قدر انہاک نہ ہو کہ اس کے علاوہ کسی اور طرف دھیان ہی نہ جائے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ!

خلاصہ یہ ہے کہ اسباب کو ضرور اختیار کریں لیکن ایک تو اس میں انہماک نہ ہو، دوسرے یہ کہ بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہو اور اسی سے انسان مانگے۔ جس کا راستہ یہ ہے کہ جب کوئی تدبیر کرنی ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے کہ یااللہ! میں یہ تدبیر تو کر رہا ہوں لیکن اس تدبیر کا نتیجہ نکالنا آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اے اللہ! اس کو کامیاب کر دیجئے۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے اس مختصر سے جملے میں

بیان فرمایا:

﴿اللهم هذا الجهد و عليك التكلان﴾

''اے اللہ! یہ میری کوشش ہے لیکن بھروسہ آپ ہی پر ہے''۔

تدبیر خواہ کسی بھی صورت میں چاہے وہ تدبیر ملازمت کی صورت میں ہو یا تجارت کی، حصول علم کی یا علاج مرض کی بہرصورت اس دعا کو پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر لیا کرو۔ انشاء اللہ توکل کی دولت حاصل ہو جائے گی۔

رجوع الی اللہ کی عادت اپناؤ

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے تھے کہ تم کہاں وہ مجاہدے کرو گے جو پہلے بزرگوں نے کیے، اس لیے تمہیں چھوٹے چھوٹے چٹکلے بتا دیتا ہوں کہ اگر ان پر عمل کرلو گے تو انشاء اللہ محروم نہیں رہو گے۔ وہ چٹکلے یہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی عادت ڈالو۔ یہاں تک کہ اگر گھر سے کسی مقصد کے لیے نکلے ہو اور وہاں سواری کے ذریعے جانا ہے تو اس کو اختیار کرو لیکن دل میں یہ خیال لاؤ کہ اے اللہ! یہ سواری تو آپ نے مجھے دے دی اب اس کو منزل مقصود تک آپ پہنچا دیجیے۔ اور ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ سے یہ منقول دعا بھی پڑھ لیا کرو۔

۱۔ ﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ﴾

''پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لیے اس سواری کو مسخر فرما دیا حالانکہ ہم اس کو قابو میں کرنے والے نہ تھے''۔

(سورۃ الزخرف: ۱۳)

۲۔ ﴿اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِی الْاَهْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ﴾

''اے اللہ! سفر کے ساتھ بھی آپ ہیں اور میرے پیچھے میرے گھر والوں، مال اور اولاد کی نگہبانی کرنے والے بھی آپ ہیں''

۳۔ ﴿اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَفَرِ وَ کَابَةِ الْمَنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِی الْاَھْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ﴾

''اے اللہ میں سفر کی مشقت سے اور بری حالت کے دیکھنے سے اور گھر بار، اہل و عیال میں بری واپسی سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں''۔ (رواہ مسلم)

یعنی اسباب کو اختیار کرنا تو ہے لیکن نگاہ اللہ تعالیٰ پر ہے۔

توکل ایسے اختیار کرتے ہیں

غرض توکل کے بارے میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جانے کے بعد میں نے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں دیکھی، یعنی اس کی وجہ سے جو درجات بلند ہوتے ہیں وہ کسی اور عمل کی بدولت نہیں ہوتے۔ لہٰذا اس کو حاصل کرنا ہم سب کے لیے ضروری ہے جس کی ہمیں مشق کرنی ہے۔ ہمارے حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے ''الحمد للہ کبھی اس میں تخلف نہیں ہوتا'' کہ جب کوئی شخص سوال کرنے کے لیے آتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے تو میں فوراً دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ یااللہ! نامعلوم یہ کیا سوال کر بیٹھے اس سوال کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دے'' اسی کو توکل کہا جاتا ہے۔

نبی اکرم سرور دو عالم ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اللہ سے مانگو! اس لیے کہ موچی اور پیسے سب اس کے تابع فرمان ہیں۔ جب تک اس کا حکم نہیں ہوگا آپ کے جوتے کا تسمہ بھی نہیں لگے گا اور اس کا اندازہ عمل کے وقت ہوگا کہ یہ کیسی عجیب دولت ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں یہ باتیں تم کو ایک لمحے میں بتا دیتا ہوں اس لیے اس کی قدر نہیں ہوتی جب اس کی مشق کرو گے تب اس دولت کے بارے میں پتہ لگے گا۔

توکل کا ایک لازمی حصہ یہ بھی ہے کہ جو دل میں خیر کا کام آئے اس کو اللہ سے ضرور مانگو لیکن پھر اللہ کے فیصلے پر راضی بھی رہو۔ اسی کو ''رضا بالقضاء'' کہا جاتا ہے۔ لہٰذا جب اللہ جل شانہ کی طرف سے فیصلہ ہو جائے تو اس پر بہت زیادہ واویلا کرنے اور شور مچانے کی کوئی ضرورت نہیں، ہاں اگر طبعی طور پر فیصلہ دوسرا ہو جانے کی وجہ سے کچھ رنج و ملال ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھتے رہا کریں:

﴿اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾

''میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے''۔ (سورۃ المومن: ۴۴)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(آمین)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔
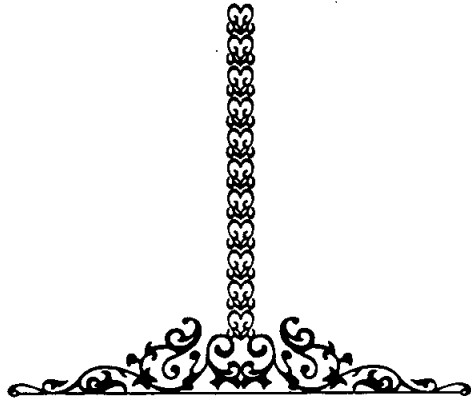
اللہ کے لیے جینا مرنا

﴿اللہ کے لئے جینا مرنا﴾

بعد از خطبہ:

عرصۂ طویل کے بعد آپ حضرات سے ملاقات کا موقع مل رہا ہے اور شاید اس سے قبل اتنا لمبا عرصہ نہ ہوا ہو۔ مختلف سفر اور مختلف اعذار کی وجہ سے حاضری نہ ہوسکی لیکن الحمد اللہ مومن کا کسی بھی حال میں گھاٹا نہیں بشرطیکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ایمان کامل عطا فرما دیں اور صحیح فکر و عمل عطا فرمائیں۔ انسان جس حال میں ہو اگر اس حال کے مناسب انسان کام کرتا رہے تو یہ سب دین کا حصہ ہے۔

یہ جو ہم قربانی کرتے ہوئے ایک آیت کریمہ پڑھتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی ہے کہ قربانی کے وقت یہ آیت پڑھی جائے۔

﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

''بیشک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ
رب العالمین کے لیے ہے''۔ (الانعام: ۱۶۳)

یہ ایک عجیب وغریب آیت ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں حضور اکرم ﷺ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ فرما دیجئے کہ میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے قربانی کے وقت ان الفاظ کی ادائیگی کو سنت بنا دیا۔

اخلاص کی برکت

دراصل اس آیت کریمہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مومن کا ہر لمحہ خواہ وہ کسی بھی حال میں ہو اللہ کے لیے ہونا چاہئے۔ جہاں تک عبادتوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں تو یہ آیت واضح ہی ہے کہ ہر عبادت اللہ کے لیے ہونی چاہئے۔ اور یہی معنی اخلاص کے بھی ہیں کہ انسان کی عبادت کا مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہو جو ہر عبادت کی روح ہے۔ چنانچہ اگر کسی مختصر سی عبادت میں بھی اخلاص ہو تو اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت زیادہ اجر وثواب کا موجب ہے اور اگر بڑی سے بڑی عبادت میں اخلاص نہ ہو تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

اخلاص کی اہمیت پر ایک واقعہ

قربانی کا معنی عربی زبان میں یہ ہے کہ وہ چیز جس سے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے اور قرب حاصل ہوتا ہے اخلاص سے۔ پس اگر کوئی آدمی چھوٹی سی بھی قربانی کر دے لیکن اس میں اخلاص شامل ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہے اور اگر بڑے سے بڑے جانور کی قربانی کی لیکن اس میں اخلاص شامل نہ تھا تو اس

قربانی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں نے قربانی پیش کی جن میں سے ایک کا نام ہابیل تھا اور دوسرے کا قابیل۔ قابیل نے ایک موٹے تازے دنبے کی قربانی پیش کی اور ہابیل کو کوئی دنبہ وغیرہ میسر نہیں آیا تو اس زمانے میں اس بات کی بھی اجازت تھی کہ اگر نفلی قربانی ہو اور کوئی جانور میسر نہ ہو تو گندم کے خوشے قربانی کے طور پر دے دیے جائیں۔ اس زمانے میں دستور یہ تھا کہ جو قربانی اللہ تعالیٰ قبول فرما لیتے تھے اس کے لیے آسمان سے آگ اترتی تھی اور اس کو جلا دیتی تھی اور آگ نہ اترنا اس بات کی علامت تھی کہ قربانی قبول نہیں ہے۔ تو ہابیل اور قابیل کی قربانی میں سے ہابیل کی قربانی کو آگ نے جلا دیا اور دنبہ یونہی پڑا رہ گیا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ﴾ (المائدہ: ۲۷)

''ہابیل اور قابیل نے قربانی پیش کی تو ان دونوں میں سے ایک کی قربانی قبول ہو گئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی''۔

اب قابیل کہ جس کی قربانی قبول نہیں ہوئی تھی اس نے ہابیل سے کہا کہ میں تجھے مار ڈالوں گا۔ قصہ تو طویل ہے لیکن کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بظاہر دیکھنے میں قابیل کی قربانی زیادہ قیمتی ہے اور ہابیل کی قربانی معمولی ہے لیکن اس کے باوجود ہابیل کی معمولی قربانی قبول ہو گئی۔ معلوم یہ ہوا کہ اخلاص بہت اہم چیز ہے۔

زندگی کا ہر کام اللہ کے لیے ہو

یاد رکھیے! کہ عبادات میں تو اخلاص ضروری ہے جیسا کہ قرآن حکیم نے فرمایا ''اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ'' لیکن آگے جو عجیب بات ارشاد فرمائی وہ یہ ہے:

﴿وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

''کہ میرا جینا مرنا بھی اللہ کے لیے ہے''۔

یعنی عبادات کے علاوہ تمام کام جو زندگی سے متعلق ہیں، وہ سب اللہ رب العالمین کے لیے ہوں۔ چنانچہ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، کمانا، ہنسنا اور بولنا سب اللہ کے لیے ہونا چاہئے۔ اگرچہ بظاہر یہ تمام کام اپنے نفس کے لیے نظر آ رہے ہیں لیکن اگر انسان چاہے تو صحیح نیت کر کے اس کام کو اللہ تعالیٰ کے لیے بنا سکتا ہے اور جب وہ کام اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جاتا ہے تو وہ عبادت بن جاتی ہے اور پھر اس پر اجر وثواب مرتب ہوتا ہے۔

نفس کا حق

مثلاً انسان بھوک کے تقاضے کی وجہ سے کچھ کھانا چاہتا ہے اب بظاہر تو وہ کھانا ہی ہے اور نفس کے تقاضے کا عمل ہے۔ اب اس وقت ایک لمحے کے لیے رک کر یہ تصور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے میرے نفس کا بھی مجھ پر حق رکھا ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا﴾

''تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے'' (رواہ البخاری)

اور نفس کا حق یہ ہے کہ اسے مناسب غذا فراہم کی جائے کیونکہ یہ نفس میری ملکیت میں نہیں بلکہ یہ بھی دینے والے کی عطا ہے جو میرے پاس امانت ہے اور اس کو غذا اس نیت سے فراہم کی جائے تاکہ اس میں اللہ کی بندگی کی طاقت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کو بھوک لگی ہو اور کھانا بھی موجود ہو لیکن وہ اس کو نہ کھائے اور مسلسل بھوکا رہے اور اسی بھوک کے عالم میں بھوک کی وجہ سے وہ مر

جائے یاد رکھئے! وہ حرام موت مرا۔

یہ جان اللہ کی امانت ہے

اسی سے بھوک ہڑتال کا حکم معلوم بھی ہو گیا کہ بہت سے لوگ نہ کھانے کا ارادہ کر لیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی جان کو اپنی ملکیت میں سمجھ رکھا ہے، اسی وجہ سے وہ اس کے ساتھ جو چاہتے ہیں کر گذرتے ہیں۔ اور لوگوں میں ایک مرض یہ بھی ہے کہ اگر بھوک ہڑتال کے دوران کوئی شخص مر جائے تو وہ ''شہید اعظم'' کہلاتا ہے کہ اس نے اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہوئے جان دے دی اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ حرام موت مرا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ تھا کہ ہم نے یہ نفس جو تمہیں امانت کے طور پر دیا ہے تم پر اس کے کچھ حقوق ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿يَآيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾

''اے رسولو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک کام کرو''۔

(المؤمنون: ۵۱)

یہ نفس ہم نے تمہیں اس لیے دیا ہے کہ تم اسے اچھے سے اچھا کھلاؤ اور ساتھ ساتھ اچھے سے اچھا عمل بھی کرو۔ یہ نفس تمہیں اس لیے نہیں دیا کہ تم اسے بھوکا مار دو۔ لٰہذا یہ تصور کہ یہ نفس میری ملکیت ہے غلط ہے۔ جب بھوکا رہنے سے بچنا ضروری ہوا اور بھوکا رہنا بلاوجہ حرام ہوا تو مطلب یہ ہو گیا کہ واجب واجب ہے۔ لٰہذا کھانا کھاتے وقت یہ نیت کرو کہ اللہ تعالیٰ کے عائد کیے ہوئے فریضے کی وجہ سے میں کھا رہا ہوں تو یہ عمل اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگا اور اس پر اجر و ثواب ہوگا۔ نیز یہ بھی نیت کر لو کہ جناب رسول اللہ ﷺ بھی کھانا کھاتے تھے۔ یہاں تک کہ معترضین نے اعتراض کر دیا کہ کیسا پیغمبر ہے کہ ہماری طرح کھانا کھاتا ہے اور

ہماری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ آسمان سے کوئی فرشتہ پیغمبر بن کر نازل ہوگا جس کو کھانے پینے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ حالانکہ پیغمبر انسانوں میں اسی لیے بھیجا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ کوئی اور مخلوق نہیں بلکہ تمہیں میں سے ایک فرد ہے اور جیسی خواہشات تمہاری ہیں اسی طرح اس کی بھی خواہشات ہیں اور اسی لحاظ سے یہ کھانا بھی کھاتا ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے کھانا کھانا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہوا۔

بسم اللہ پڑھنے کی وجہ

پھر کھانا کھاتے وقت ابتداء میں بسم اللہ پڑھنی چاہئے۔ یہ بسم اللہ کا جو حکم ہے اس لیے نہیں کہ بسم اللہ کوئی منتر ہے بلکہ اس طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے ہے کہ میں جو کھانا کھا رہا ہوں وہ اللہ کی رضا کے لیے کھا رہا ہوں۔ یہ کھانا اسی کی عطا ہے اسی کا حکم ہے اور اسی کے نبی ﷺ کی سنت ہے۔ پھر کھانا کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرو۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا﴾

تو یہ کھانا اللہ کے لیے ہو جائے گا۔ اسی طرح نیند آنے کے وقت سونے کا عمل بظاہر تو نفس کا تقاضا ہے لیکن اگر یہ نیت کرلی جائے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿اِنَّ لِعَیْنِكَ عَلَیْكَ حَقًّا﴾

''کہ تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے''

تو یہ سونا بھی اللہ کیلیے ہو جائے گا۔ یہ جو سرکاری مشین اللہ تعالیٰ نے

تمہیں دی ہے یہ پیدائش سے لے کر مرتے دم تک تمہارا ساتھ دیتی ہے۔ اس کو نہ کسی سروس کی ضرورت ہے اور نہ تیل ڈالنے کی۔ لہٰذا اس کا حق یہ ہے کہ اس کو تھوڑا آرام بھی دو۔ اسی طرح مزدوری کے ذریعے بظاہر تو مقصد پیسے کمانا ہوتا ہے لیکن نیت یہ کی جائے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس اور بیوی بچوں کے جو حقوق رکھے ہیں ان کی ادائیگی کے لیے کسب معاش بھی ضروری ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دوسرے فرائض کے بعد سب سے بڑا فریضہ حلال روزی کمانا ہے۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان از مشکوٰۃ جلد ا صفحہ ۲۴۲) تو اس نیت سے مزدوری اور تجارت وغیرہ بھی ثواب بن جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ صبح سے لے کر شام تک زندگی میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جس کو صحیح نیت کر کے اللہ کے لیے نہ بنایا جا سکے۔

موت اللہ کے لیے کیسے ہو؟

اور شان کریم کی آیت میں لفظ "ومماتی" یعنی میری موت بھی اللہ کے لیے کا مطلب یہ ہے کہ یا تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہوا جان دے دے یا پھر اگر جہاد کا موقع نہیں ہے تو پھر اللہ تبارک و تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ میرے حق میں بہتر سمجھیں گے مجھے موت عطا فرما دیں گے۔

اگرچہ موت کی تمنا کرنے سے منع کیا گیا ہے لیکن اس کی جگہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا تلقین فرما دی:

﴿اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِیْ مَا عَلِمْتَ الْحَيٰوةَ خَيْرًا لِّیْ تَوَفَّنِیْ اِذَا عَلِمْتَ الْوَفَاةَ خَيْرًا لِّیْ﴾

"اے اللہ جب تک میرے حق میں زندگی بہتر ہے تب تک تو

مجھے زندہ رکھ اور جب میرے حق میں موت بہتر ہو جائے تو تُو
مجھے موت دے دے"۔

(مسلم باب تمنی کراھۃ الموت جلد۴ صفحہ۲۰۶۴)

پس جب انسان نے اپنی زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے حوالے کردی تو جینا بھی اللہ کے لیے ہوا اور مرنا بھی اللہ کے لیے ہوا۔

مومن کا کسی حال میں گھاٹا نہیں

ایک مرتبہ اس چیز کا ارادہ کر کے مشق کرنے کی ضرورت ہے کہ زندگی کے ہر کام میں اللہ کو راضی کرنے کی نیت کرو۔ اگر یہ کام کرلیا تو اس سے ہر جائز کام ثواب بن جاتا ہے کیونکہ مومن کا کسی حال میں گھاٹا نہیں اگر اس کو کوئی خوشی ملتی ہے وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے تو وہ عبادت ہوتا ہے۔ اگر اس کو غم لاحق ہو جائے، وہ اس پر صبر کرتا ہے اور "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" پڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور مشیت پر سر تسلیم خم کر دیتا ہے تو پھر اس کی طرف قرآن حکیم کا یہ ارشاد متوجہ ہوتا ہے:

﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾

(الزمر: ۱۰)

"صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا"۔

گویا جب اللہ کی خاطر کسی بھی چیز پر صبر کیا جاتا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ بے بہا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

سنت پر عمل کرنے والا قریب ہے

میں نے شاید اس سے قبل یہ واقعہ سنایا ہو کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک مشہور اور بڑے لاڈلے صحابی تھے۔ ان سے حضور اقدس ﷺ اپنی دلی باتیں بھی کہہ دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتے تھے۔

تقریباً ۹ ہجری کا واقعہ ہے کہ دینی مصلحت کا تقاضا یہ ہوا کہ ان کو یمن بھیج دیا جائے کیونکہ یمن فتح ہو چکا تھا اور وہاں کسی ایسے حاکم کی ضرورت تھی جو حکومت بھی کرے اور لوگوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ بھی انجام دے۔ حضور اقدس ﷺ کی نگاہ انتخاب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پر پڑی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم یمن چلے جاؤ اور ان کو مدینہ منورہ سے اس شان کے ساتھ رخصت کیا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار تھے اور حضور ﷺ پیدل ان کے گھوڑے کی باگ تھامے انہیں کافی دور تک رخصت کرنے کے لیے جا رہے تھے۔ اس وقت حضور ﷺ کو بذریعہ وحی یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ میری زندگی اب اس دنیا میں تھوڑی ہی ہے۔ ادھر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی جلدی واپسی کی کوئی توقع نہ تھی۔ لہٰذا حضور اقدس ﷺ نے چلتے چلتے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے معاذ! شاید یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات ہو اور اس کے بعد تم مجھے نہ دیکھ سکو۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اتنے جانثار صحابی اب تک نجانے کس طرح ضبط کر رہے تھے لیکن جب یہ جملہ سنا کہ اے معاذ! آج کے بعد شاید تم مجھے نہ دیکھ سکو تو اندر سے غم و اندوہ کا لاوہ ایک دم پھوٹ پڑا اور حضرت معاذ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور آپ ﷺ کی آنکھوں میں بھی آنسو آنے لگے تو

آپ ﷺ نے چہرہ آبادی کی طرف پھیر لیا اور فرمایا اے معاذ! اگر چہ تم مجھ سے جدا ہو رہے ہو لیکن یاد رکھو کہ جو شخص میری سنت پر عمل کرنے والا ہے وہ ہر وقت مجھ سے قریب ہے چاہے وہ دور ہی کیوں نہ ہو اور جو شخص میری سنت پر عمل نہیں کرتا وہ مجھ سے دور ہے چاہے وہ کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔

ایک عجیب واقعہ

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ جب آنحضور ﷺ کے روضہ اقدس پر حاضر ہوتے تھے تو عام طور سے روضہ اقدس کی جالی کے سامنے کچھ دور جو ایک ستون ہے اس کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے تھے، جالی کے قریب نہیں جاتے تھے۔ ایک دن فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ مجھے یہ خیال ہوا کہ پتا نہیں تمہارے دل کی کیا قساوت ہے کہ سب لوگ تو جالی کے قریب جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس تک پہنچ جاتے ہیں اور تم آگے نہیں بڑھ پاتے، پیچھے ہی رہتے ہو؟ تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے روضہ اقدس میں سے آواز آ رہی ہو کہ جو شخص ہماری سنت پر عمل پیرا ہے وہ ہم سے قریب ہے خواہ ظاہری نظر میں ہم سے کتنے ہی فاصلے پر ہو، اور جو شخص ہماری سنت پر عمل پیرا نہیں وہ ہم سے دور ہے چاہے وہ ہمارے روضے کی جالیوں سے چمٹا ہوا ہو۔

حاصل کلام یہ کہ ایک مومن کا مقصود آنحضرت ﷺ کی سنتوں پر عمل کرتے ہوئے اللہ جل جلالہ کی رضامندی ہے۔

نہ تو ہے ہجر ہی اچھا، نہ وصال اچھا
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا

محبت کا اصل تقاضہ یہ ہے

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھ لیجئے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، نبی کریم ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے لیکن موت کے وقت یہ کیفیت ہے کہ کوئی تو قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے فوت ہو رہا ہے اور کوئی سندھ میں آکر شہید ہو رہا ہے۔ حالانکہ بظاہر محبت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جہاں آپ ﷺ تشریف فرما ہیں انسان وہاں سے ہلے ہی نہ۔ لیکن وہ محبت کے اصل تقاضے کو جانتے تھے کہ محبت کا اصل تقاضہ یہ نہیں ہے کہ محبوب سے چمٹے رہو بلکہ اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ محبوب کی رضا کے مطابق کام کرو۔

عشق تسلیم و رضا کے ماسوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے کوش نہ ہوں تو پھر وفا کچھ بھی نہیں

لہٰذا اگر ایک مومن اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل پیرا ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے قریب ہے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی دور ہو۔

اللہ تعالیٰ کبھی اس طرح بھی نواز دیتے ہیں

حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ کا ایک واقعہ میں نے اپنے والد ماجد اور اپنے شیخ حضرت عارفی قدس اللہ اسرارھما سے سنا ہے کہ ایک شخص حضرت حاجی صاحب کے سامنے آکر یہ کہتا تھا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ہر سال حج کرتے ہیں تو حسرت ہوتی ہے کہ لوگوں کو تو بار بار حاضری ہو رہی ہے اور مجھے چونکہ وسائل میسر نہیں اس لیے حاضری کی توفیق نہیں ملتی۔ تو حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ نے فرمایا یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ صرف مکہ اور مدینہ

میں ہی ہیں یا یہاں بھی ہیں؟ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ ہر جگہ ہیں اور تم وسائل نہ ہونے کی وجہ سے وہاں نہ پہنچ پائے تو کیا اللہ تمہیں صرف اس وجہ سے محروم کر دیں گے کہ تمہارے پاس پیسے نہیں تھے؟ تم اللہ کے ساتھ ایسی بدگمانی کرتے ہو؟ یاد رکھو! اگر تمہاری نیت یہ ہو کہ جب کبھی وسائل مہیا ہوں گے تو انشاء اللہ وہاں حاضری دوں گا۔ تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں سے بھی حصہ عطا فرمائیں گے اور تمہیں محروم نہیں فرمائیں گے۔ ان کی شان تو یہ ہے کہ کبھی تو نیکی پر نواز دیتے ہیں اور کبھی نیکی کی حسرت پر انعام عطا فرما دیتے ہیں۔

نیکی کی حسرت پر لوہار کا درجہ بڑھ گیا

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو کسی شخص نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑی رحمت کا معاملہ فرمایا لیکن وہ درجہ مجھے نصیب نہ ہوا جو میرے پڑوس میں رہنے والے لوہار کو ملا، کیونکہ اگرچہ وہ لوہار تھا لیکن جونہی اس کے کان میں ”حی علی الصلوۃ“ کی آواز پڑتی تو اگر اس نے ہتھوڑا سر پر بلند کر رکھا ہوتا تو بجائے اس کے کہ وہ لوہے پر دے مارتا، وہ ہتھوڑا پیچھے پھینک دیتا تھا اور نماز کے لیے چلا جاتا تھا اور اپنی بیوی سے یہ کہا کرتا تھا ہم تو دن رات دنیاداری کے کام میں مشغول رہتے ہیں اس لیے ہمیں موقع نہیں ملتا کہ جس طرح یہ اللہ کے بندے ساری رات کھڑے ہو کر نماز پڑھتے رہتے ہیں اسی طرح ہم بھی پڑھتے۔ اگر ہمیں بھی فراغت ہوتی تو ہم بھی عبداللہ بن مبارک کی طرح رات کے وقت عبادت کر لیا کرتے۔ تو للہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تجھے تیری اسی حسرت پر نواز دیا اور تجھے وہ درجہ دیا جو عبداللہ بن مبارکؒ کو بھی نہ دیا۔

ایک بزرگ اور ایک عورت کی خواہش

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے اپنے ایک وعظ میں ارشاد فرمایا کہ ایک بزرگ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں بڑے خزائن سے نوازا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت بڑے بزرگ بھی سمجھے جاتے تھے۔ آخری عمر میں انہوں نے سوچا کہ مدینہ منورہ چلا جاؤں تاکہ وہیں پر موت آئے اور جنت البقیع کی مٹی نصیب ہو۔ چنانچہ وہ بزرگ وہاں جاکر مقیم ہو گئے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا اور انہیں جنت البقیع میں دفن کر دیا گیا اور بظاہر ان کی آرزو پوری ہو گئی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد اس بزرگ کے مدفن کو کھودنے کی ضرورت کسی وجہ سے پیش آگئی، چنانچہ جب اسے کھود کر دیکھا تو وہ بزرگ وہاں سے غائب تھے اور ان کی جگہ ایک یورپین عورت پڑی ہوئی تھی۔ لوگ بڑے حیران و پریشان ہوئے اور یہ خبر سن کر بہت بڑا مجمع اسے دیکھنے کے لیے آگیا۔ اس مجمع میں شامل لوگوں نے دیکھا تو اس میں ایک شخص کچھ عرصہ فرانس میں رہ کر آیا ہوا تھا، اس نے کہا کہ میں اس عورت کو پہچانتا ہوں۔ یہ تو پیرس میں تھی اور مسلمان ہو گئی تھی۔ لوگوں نے کہا کہ ہم نے تو اس جگہ ان بزرگ کو دفن کیا تھا، یہ عورت یہاں کیسے آگئی؟ پھر اس قصے کی تحقیق کی گئی۔ چنانچہ لوگوں نے ان کی بیوی سے اس بارے میں پوچھا کہ کیا کوئی خاص بات ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں یہاں دفن ہونے کی فضیلت سے محروم رکھا؟ تو انہوں نے کہا ویسے تو وہ بزرگ آدمی تھے البتہ ان میں ایک یہ بات تھی کہ کبھی کبھی کہا کرتے تھے کہ اسلام میں ساری باتیں تو بہت اچھی ہیں لیکن غسل جنابت کی پابندی بڑی کٹھن ہے، جب کہ عیسائی مذہب میں یہ بات اچھی ہے کہ اس میں غسل جنابت فرض نہیں اور اس عورت کے متعلق اس شخص نے بتایا کہ اس عورت کی

مسلمان ہونے کے بعد یہ خواہش تھی کہ کاش! میں کسی طرح مدینہ منورہ جا کر مروں اور جنت البقیع میرا مدفن ہو، تو اللہ تعالیٰ نے دفن کے بعد بھی اس عورت کی حسرت کو اس طرح پورا کیا کہ اس کو اندر ہی اندر جنت البقیع منتقل فرما دیا۔

لہٰذا نیک کام کی توفیق ہو جائے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرو اور جو کام بن نہ پڑے تو کم از کم دل میں یہ ہمت رکھو کہ اگر وسائل میسر آتے تو میں یہ کام کرتا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں نوازنے میں کوئی کمی نہیں۔

کوئی جو ناشناس ادا ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

روزانہ کا معمول

میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفیؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم نماز فجر پڑھ چکو تو ایک مرتبہ دل سے نیت کرو کہ آج میں جو کام بھی کروں گا وہ اللہ کے لیے کروں گا۔ اس کے بعد جب اپنی ڈیوٹی پر جانے کے لیے گھر سے نکلنے لگو تو یہ نیت کرلو کہ میں اللہ تعالیٰ کے عائد کیے ہوئے فریضے کو ادا کرنے جا رہا ہوں۔ اس سے خود بخود دل میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ یہ کام میں اللہ کے لیے کر رہا ہوں۔ لہٰذا اس کے عائد کیے ہوئے احکام کے مطابق کروں گا۔ پھر وہ شخص رشوت، جھوٹ، فریب، دھوکے دہی وغیرہ چیزوں کے ارتکاب میں مبتلا نہ ہوگا۔ پھر جب گھر واپس آجاؤ تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے یہ نیت کرلو کہ میں اپنے گھر والوں سے گفتگو، ہنسنا بولنا اللہ کے حکم کی وجہ سے کروں گا۔ پھر رات کے وقت اس بات کا جائزہ لو کہ میں اپنی نیت کے مطابق کام میں مشغول رہا یا نہیں۔ جتنے کام نیت کے مطابق ہوئے اس پر اللہ کا شکر ادا کرو اور جو نیت کے مطاق نہ ہو سکے

اس پر استغفار کرو۔ اس استغفار و توبہ کی برکت سے ایک درجہ بلند ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت نصیب ہوگی اور توبہ اللہ تعالیٰ کو بڑی محبوب ہے۔

بچا بچا کے نہ رکھ اسے کہ یہ آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

یہ اپنے روزانہ کا معمول بنا لو اور صبح کو اٹھ کر یہ آیت پڑھ لو:

﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ انشاء اللہ رفتہ رفتہ بھکنے کے مواقع ختم ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے جو شخص اس کے راستے پر چلنا شروع کرے تو وہ گرتا پڑتا منزل تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ جو شخص ہمارے راستے میں کوشش کرتا ہے ہم اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے راستے پر لے جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا﴾

(العنکبوت: ۶۹)

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ بچہ جب چلنا شروع کرتا ہے تو ایک دم ہی چلنا شروع نہیں کر دیتا بلکہ گرتے پڑتے چلتا ہے تو سامنے سے ماں باپ اسے بلاتے ہیں، جب وہ چلتے چلتے گرنے لگتا ہے تو ماں باپ اسے آگے بڑھ کر پکڑ لیتے ہیں اور اسے گرنے نہیں دیتے، تو پھر ارحم الراحمین اپنے بندوں کو کیسے چھوڑ سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا کی خاطر عمل کی توفیق عطا فرمائیں اور اپنی رضا کی خاطر جینے اور مرنے کا جذبہ عطا فرمائیں۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

توبہ اور اسکی شرائط

موضوع = توبہ اور اس کی شرائط
بیان = جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ
ضبط و ترتیب = محمد ناظم اشرف (فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی)
مقام = جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن، لاہور
باہتمام = محمد ناظم اشرف
ناشر = بیت العلوم۔ ۲۰ نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی، لاہور
فون: ۷۳۵۲۴۸۳

﴿توبہ اور اس کی شرائط﴾

بعد از خطبہ:

﴿يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾

(آیت نمبر ۸ پ ۲۸ سورۃ التحریم)

بزرگان محترم اور برادران عزیز: السلام علیکم و رحمۃ اللہ وبرکاتہ

جیسا کہ اس سے پہلے بھی یہ بات کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے اس ماہانہ اجتماع کا بنیادی مقصد کوئی رسمی تقریر، وعظ، یا درس نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اصل مقصد اپنی اصلاح کی فکر اور آخرت کی تیاری ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ہر لمحے اور ہر منٹ قبر کی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جو لمحہ بھی گذرتا ہے وہ ہمیں موت سے قبر سے اور آخرت سے قریب کرتا ہے۔

حضرت مجذوبؒ فرماتے ہیں:

لحظہ لحظہ لمحہ لمحہ دم بدم
ہو رہی ہے عمر مثل برف کم

جس طرح برف کی ایک سل گرمی میں رکھ دی جائے تو وہ ہر لمحے پگھلتی جائے گی یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا کہ وہ پوری سل ختم ہو جائے گی۔ ہم میں سے ہر شخص کا حال یہ ہے کہ وہ ہر لمحے، ہر لحظے، اور ہر منٹ اپنی زندگی سے دور اور موت و قبر سے قریب ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ فکر کرنی چاہئے کہ مرنے کے بعد کیا حالات پیش آنے والے ہیں اور ان کے لیے ہم کتنی تیاری کر رہے ہیں۔ اور اگر ان پیش آنے والے حالات کے لیے تیاری نہیں کر رہے تو کیا کرنا چاہئے؟ اور اس معاملے میں ہمارے اندر جو کوتاہیاں اور غلطیاں پائی جاتی ہیں ان کی اصلاح کیسے کی جائے؟ ہماری اس مجلس میں نہ تو کوئی ناصح ہے اور نہ ہی کوئی شاگرد، ہم تو یہاں یہ سوچتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کے سامنے کیا جواب دیں گے؟

طلب صادق کی برکت

جب یہ بات مقصد ٹھہری کہ یہ بات کسی فرد واحد کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار اور ایک ہی منزل کے رہرو ہیں۔ اسی لیے اللہ جل شانہ کی سنت ہے جو کہ صدیوں سے چلی آ رہی ہے کہ جب کوئی بندہ اس کے دین کی خاطر اپنے گھر سے چل کر آتا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کی طلب کی برکت سے اس مجلس پر اپنی رحمتوں اور برکتوں کی بارش فرما دیتے ہیں۔ کوئی استاد ہو، پیر ہو، شیخ ہو، کوئی بھی ہو، اپنے مرتبہ کی وجہ سے کوئی کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔ دینے والی ذات تو صرف ایک اللہ کی ہے، ہاں جب اللہ جل شانہ کسی پر اپنا کرم فرمانا چاہیں تو کسی بھی شخص کو اس کے لیے واسطہ اور ذریعہ بنا دیتے ہیں۔ لہٰذا اگر طلب صادق اور سچی ہو اور واقعتہً اللہ جل شانہ کی رضا مقصود ہو تو جو آدمی بات کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی زبان اور اس کے دل پر وہی بات جاری فرما دیتے ہیں جو

اس کے حق میں فائدہ مند ہوتی، یہ اللہ جل شانہ کی سنت ہے۔ اس میں کہنے والے کا کمال ہے اور نہ سننے والے کا، بلکہ یہ تو دینے والے کی دین ہے اور مالک حقیقی کی عطا ہے وہ اپنے فضل و کرم سے کہنے والے کے قلب میں وہ بات ڈال دیتے ہیں اور زبان پر جاری فرما دیتے ہیں کہ جو کہنے والے کے حق میں بھی فائدہ مند ہو اور سننے والے کے حق میں بھی۔

اصلاح کا پہلا قدم توبہ ہے

جب ہماری مجلس اور ہمارے اجتماع کا اصل مقصد اپنی اصلاح اور آخرت کی تیاری کی فکر کرنا ہے تو اس کا سب سے پہلا قدم اور اس منزل تک لے جانے والی سب سے پہلی سیڑھی جو بزرگان دین نے بیان کی ہے وہ ہے توبہ۔ جب کوئی طالب اصلاح کسی مصلح بزرگ کے پاس جاتا ہے اور بیعت کی درخواست کرتا ہے یا اس سے اصلاحی تعلق قائم کرتا ہے تو سب سے پہلا سبق اور سب سے پہلا درس جو نبی اکرم سرور دو عالم ﷺ کے زمانے سے آج تک دیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ انسان توبہ کرے، اپنی پچھلی زندگی میں کیے ہوئے غلط اعمال چاہے وہ گناہ ہوں، معصیتیں ہوں، خلاف سنت امور ہوں یا مکروہات و منکرات ہوں سب سے توبہ کرے۔ امام غزالیؒ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ جو شخص سفر آخرت کا ارادہ لے کر چلے، اس کا سب سے پہلا سبق توبہ ہے۔

توبہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے

اب انسان کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنی سابقہ زندگی اور اس میں کیے ہوئے غلط اعمال سے توبہ کرے اور آئندہ ان گناہوں سے بچنے کا عزم

کرے کہ میں حتی الامکان ان گناہوں سے بچوں گا۔

توبہ و استغفار اصلاحی نصاب کا سب سے پہلا سبق ہے اور اللہ جل شانہ کو توبہ اتنی پسند ہے کہ حدیث میں اس کے بارے میں ارشاد وارد ہے:

﴿کلکم خطّاء ون و خیر الخَطائین التوّابون﴾

(رواہ الترمذی و ابن ماجہ و الحاکم)

''کہ تم میں سے ہر شخص خطا کار ہے۔ لیکن خطا کاروں میں سب سے بہتر لوگ کثرت سے توبہ کرنے والے ہیں''۔

شیطان کو پیدا کرنے کا مقصد:

حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ شیطان کو بھی پیدا کیا تاکہ اس کے ذریعے انسان کا امتحان اور آزمائش کی جائے۔ شیطان، انسان کو قدم قدم پر گناہ کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے اور گناہ کرنے کا شوق اور اس کا داعیہ اس کے دل میں پیدا کرتا ہے، کیونکہ اس کا تو کام ہی یہی ہے کہ صبح شام گناہوں کو دلفریب اور دلکش بنا کر پیش کر کے گناہوں پر آمادہ کیا جائے۔ جب شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا تو کہا تھا کہ میں ان کے آگے سے بھی آؤں گا اور پیچھے سے بھی آؤں گا، دائیں سے بھی آؤں گا اور بائیں سے بھی، یعنی چاروں طرف سے انسان پر حملہ آور ہوں گا تاکہ وہ گناہوں میں مبتلا ہو کر اپنے رب کی نافرمانی کرے۔

شیطان کو پیدا کرنے کا مقصد ہی انسان کی آزمائش ہے کہ آیا وہ شیطان کی بات مانتا ہے یا اپنے خالق و مالک کی، شیطان گویا ایک زہر ہے جو تخلیق کیا گیا

لیکن اللہ جل شانہ کی حکمتِ کاملہ سے بعید ہے کہ وہ زہر پیدا فرما دیں اور تریاق پیدا نہ کریں، اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ نے جہاں زہر پیدا فرمایا وہیں تریاق کا بندوبست بھی فرما دیا۔

زہر اور تریاق کا ایک عجیب واقعہ

مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ میں جنوبی افریقہ کے ایک پہاڑی علاقے میں کار پر سوار جا رہا تھا، راستے میں نماز کے لیے رکنا ہوا، جنگل تھا اور باہر بہت خوبصورت سبزہ زار تھے، جب کار سے اترے تو مجھے قریب میں ایک بہت خوبصورت پودا نظر آیا جس کے پتے بہت خوبصورت تھے، بے ساختہ میرا دل چاہا کہ اس پتے کو پکڑ کر کونپلوں سے توڑ لوں اور اس کو دیکھوں کہ یہ کیسا ہے؟ جب میں اس کی طرف بڑھنے لگا تو میرے ایک ساتھی مجھ سے کہنے لگے کہ ہرگز اس کو ہاتھ نہ لگائیے گا! میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ یہ بڑا زہریلا پودا ہے اور اگر انسان اس پودے کو چھولے تو اس کے جسم میں زہر ایسے سرایت کرتا ہے جیسا کہ بچھو نے کاٹ لیا ہے۔ میں بہت حیران ہوا کہ دیکھنے میں کتنا خوبصورت اور حسین ہے اور انسان کو اپنی طرف دعوت دینے والا ہے، لیکن اندر سے اتنا ظالم؟۔ اسی طرح دنیا میں جتنی بھی دلفریبیاں ہیں، ان سب کی اللہ تعالیٰ نے تصویر بنا دی کہ دیکھنے میں تو بڑی حسین لیکن چکھ لو یا چھولو تو زہر ہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ تو بڑا خطرناک پودا ہے، آپ نے مجھے تو بتا دیا اس لیے میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا لیکن بہت سے لوگ وہ بھی تو ہیں کہ جنہوں نے اگر انجانے میں اس کو چھو لیا تو ان کے جسم میں زہر پھیل جائے گا۔ اس پر انہوں نے کہا جی ہاں یہ خطرناک تو ہے لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ جس جس جگہ یہ پودا ہوتا ہے اسی

جگہ ایک اور چھوٹا سا پودا بھی ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس خطرناک پودے کو چھو لے اور زہر اس کے جسم میں پھیل جائے تو وہ اس چھوٹے پودے کو ہاتھ لگا لے تو وہ بھلا چنگا ہو جائے گا، یعنی اوپر والا پودا زہر اور نیچے والا تریاق ہے۔ یہ اللہ جل شانہ کی حکمت کاملہ ہے کہ جہاں زہر پیدا فرمایا وہیں تریاق بھی پیدا فرما دیا۔

توبہ گناہ کا تریاق ہے

اسی طرح میرے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اللہ نے اگر شیطان کو پیدا کیا تو ممکن نہیں تھا کہ تریاق پیدا نہ فرماتے۔ چنانچہ جب کوئی گناہ ہو جائے تو اس گناہ کا تریاق یہ ہے کہ یوں کہہ لو "استغفر اللّٰہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ" اور یہ ایسا تریاق ہے جو ہر وقت، ہر انسان کے پاس، ہر جگہ بغیر کسی ادنی محنت و تکلیف کے میسر ہے۔ ایک تریاق تو وہ ہوتا ہے جس کو حاصل کرنے میں محنت ہوتی ہے اور اس کو لانے کے لیے پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں، اگر خدانخواستہ کسی کو سانپ یا بچھو کاٹ لے اور معلوم ہو جائے کہ فلاں چیز اس کا علاج ہے تو سب سے پہلے تو وہ پیسوں کی فکر کرے گا اور پھر یہ کہ وہ کون سی دوکان سے ملے گی، وہ وہاں سے جا کر لائے گا تو پتہ نہیں اتنی دیر میں کیا سے کیا ہو جائے؟ فارسی کی ایک مثل مشہور ہے:

تاتریاق از عراق آوردہ شود
مارگزیدہ مردہ شود

اور دنیا کا تریاق بھی ہر آدمی کے پاس موجود نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر دوکان میں دستیاب ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا تریاق دے دیا ہے جو ہر وقت ہمارے پاس موجود ہے اس کو حاصل کرنے میں محنت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی

پیسے خرچ کرنے کی ضرورت ہے، صرف دھیان کرنے کی بات ہے کہ جب تمہیں شیطان ڈس لے اور اس کا زہر تمہارے جسم میں پھیل جائے تو اس کا تریاق موجود ہے کہ فوراً کہو کہ اے اللہ میں آپ سے آپ کی مغفرت طلب کرتا ہوں۔

توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں

یہ ایسا تریاق ہے کہ جب کوئی اس کو استعمال کر لے تو اس کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ

﴿التائب من الذنب کمن لاذنب لہ﴾

''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں'' (رواہ ابن ماجہ وطبرانی عن ابن عبداللہ ابن مسعود)

جب یہ تریاق استعمال کرلے تو اگر بڑے سے بڑا گناہ اور بڑی سے بڑی معصیت سرزد ہو جائے اور انسان کہہ لے کہ اے اللہ مجھ سے یہ غلطی ہوگئی میں آپ کے سامنے پشیمان و شرمسار ہوں اور آئندہ اس سے بچنے کی کوشش کروں گا تو یہ کہتے ہی وہ گناہ ایسے محو ہو جاتا ہے گویا کہ گناہ کیا ہی نہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ تمہیں معاف کر دیا گیا بلکہ تمہارے نامہ اعمال سے بھی اس کو مٹا دیا جائے گا اور وہ آخرت میں بھی سامنے نہیں آئے گا۔ اس مالک کی رحمتوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے کہ ایک آدمی ستر سال تک گناہوں میں مبتلا رہا، معصیتیں کرتا رہا، نافرمانیاں کرتا رہا اور ہر طرح کے گناہ اس سے سرزد ہوتے رہے لیکن اللہ نے آخر میں توفیق دے دی تو شرمندگی ہوئی، ندامت کے آنسو بہے اور صدق دل سے اللہ کے حضور توبہ کی تو ستر سال کا کیا دھرا ایک لمحے میں مٹ گیا اور ایسا ہو گیا جیسا کہ آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔

ولی اللہ بننا کوئی مشکل کام نہیں

ہمارے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ولی اللہ بننا بہت مشکل کام ہے۔ مجاہدے کرنے پڑتے ہیں اور نجانے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن کچھ بھی مشکل نہیں ہے، اسی وقت یہاں بیٹھے بیٹھے ولی اللہ بن سکتے ہو، اور وہ اس طرح کہ اپنی سابق زندگی میں جتنے گناہ کیے ہیں ان سے صدق دل کے ساتھ توبہ کرلو! جب توبہ کرلو گے تو اسی وقت سارے گناہ معاف ہو جائیں گے اور نامۂ اعمال دھل جائے گا۔ اب تم ایسے ہو جیسے کہ نئی زندگی حاصل ہوتی ہے، تمہارے دامن پر گناہ کے کسی داغ کا نشان باقی نہیں رہا اس طرح تم ولی اللہ بن گئے۔

اگر کوئی ولی اللہ بننا چاہے تو توبہ ایک ایسی چیز ہے جو انسان کی پچھلی ساری زندگی کے گناہوں کو مٹا دیتی ہے اس لیے سب سے پہلا کام توبہ کرنا ہے۔

اخلاص کی تاثیر

ہمارے ایک بزرگ حضرت بابا صاحبؒ کے نام سے مشہور تھے، حضرت حکیم الامت سے مجاز بیعت تھے، اپنے وقت کے مجذوب تھے اور عجیب حکیمانہ باتیں کیا کرتے تھے۔ جو ان کے پاس چلا گیا تو کسی نہ کسی طریقے سے اس کو راستے پر لگا لیتے تھے۔ ایک دن میں حضرت کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی کالج کا ایک نوجوان طالب علم حضرت کی خدمت میں اپنی ماں کے کہنے پر تعویذ لینے کی غرض سے حاضر ہوا، سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا، دین کا تصور نہ نماز کی فکر، خیر حضرت نے اس کو تعویذ لکھ کر دے دیا۔ جب وہ جانے لگا تو حضرت نے فرمایا کے

بیٹے! ذرا بات سننا! تو اس نے کہا جی فرمائیے! آپ نے فرمایا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ دین اور اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے حالانکہ یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں، بس ایک بات بتاتا ہوں اس پر عمل کر لیا کرو اور وہ یہ کہ رات کو سونے سے پانچ منٹ پہلے توبہ کر لیا کرو کہ یااللہ! دن بھر میں مجھ سے جو غلطیاں ہوئیں ہیں ان پر نادم و شرمسار ہوں مجھے معاف کر دے! یہ ایک بات اس طالب علم کے ذہن میں ڈال دی۔ جب کوئی بات اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے کہی جائے تو اللہ تعالیٰ اس میں تاثیر پیدا فرما دیتے ہیں۔ وہ نوجوان جسے دین کی ہوش اور پرواہ ہی نہیں تھی، کچھ ہی دنوں میں اللہ نے اس کی کایا ہی پلٹ دی، پھر اس نے مستقل طور پر حضرت کی خدمت میں آنا جانا شروع کر دیا اور گناہ گار سے پرہیز گار بن گیا۔ غرض اللہ تبارک و تعالیٰ نے توبہ ایک ایسی چیز رکھی ہے کہ جو کوئی بھی صدق دل سے توبہ کر لے تو یہ اس کے لئے بڑا زبردست تریاق ہے اور انسانی قلب کو بدل دینے والی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

نبی اکرم ﷺ کا معمول

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿انّی لاستغفر اللّٰه فی الیوم مائة مرة﴾

''کہ میں اپنے پروردگار سے ہر روز سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں''

(مسلم باب استحباب الاستغفار والاستکثار منہ جلد۴ صفحہ ۲۰۷۵)

یہ اس ذات کا حال ہے کہ جس سے کسی گناہ کا صدور ممکن ہی نہیں تھا اور اگر کسی وقت بھول چوک ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے اعلان فرما دیا کہ "لیغفر لك اللہ ماتقدم من ذنبك وماتاخر" کہ اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف۔

کر دیے۔ تو وہ ذات فرماتی ہے کہ میں دن میں ستر مرتبہ اپنے رب سے استغفار کرتا ہوں۔ ایک تو اس لئے کہ امت کو استغفار کی تعلیم دینا مقصود تھا۔ دوم یہ کہ نبی کریم ﷺ کے درجات میں مزید بلندی کے لیے آپ ﷺ کو توبہ کا حکم دیا گیا۔ ہمارے بزرگ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ اس لیے استغفار فرماتے تھے جب آپ ﷺ کا ایک درجہ بلند ہوتا تو اس بلند درجے کے مقابلے میں پچھلا درجہ آپ ﷺ کو گناہ معلوم ہوتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ اصلاح کی طرف سب سے پہلا قدم توبہ ہے۔ ایک مرتبہ سچے دل سے عاجز ہوکر اللہ کے حضور توبہ کرلو! جس سے کم از کم اتنا تو ہوگا کہ پچھلی زندگی کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی ہو جائے گی اور اب تک کا سارا معاملہ صاف اور بے باق ہو جائے گا۔

توبہ کی پہلی شرط

البتہ توبہ کے قبول ہونے کی تین شرائط ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس عمل سے توبہ کی جا رہی ہے اس پر ندامت ہو، ندامت توبہ کا جزو اعظم ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ انما التوبة الندم کہ توبہ نام ہے ندامت کا، اس کے بغیر توبہ نہیں ہوتی، لیکن ظاہر ہے کہ ندامت وہاں ہوگی جہاں آدمی غلطی کو غلطی، اور گناہ کو گناہ سمجھے۔ اگر آدمی گناہ کو گناہ اور غلطی کو غلطی ہی نہیں سمجھتا تو ندامت کس چیز کی ہوگی؟ لہٰذا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ آدمی گناہ کو گناہ سمجھے۔ آج کل کے لوگ گناہ کو گناہ سمجھتے ہی نہیں ہیں اور اس پر بجائے ندامت کے اظہار کے، تاویلات کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی ان کو کہے کہ یہ گناہ ہے تو وہ اس سے بحث و مباحثہ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں جو کہ سب سے بڑی بیماری ہے، کیونکہ بحث مباحثہ کی وجہ سے اس گناہ

پر ندامت نہیں، جب ندامت نہیں تو توبہ نہیں اور جب توبہ نہیں تو معافی کہاں سے ہو؟ اس لیے اس طرز عمل سے ہمیشہ پرہیز کرو کہ جس چیز کو علمائے امت حرام اور ناجائز کہہ رہے ہیں، اگر اس کو برت بھی رہے ہو تو کم از کم گناہ تو سمجھو! جس کی برکت سے کبھی نہ کبھی اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق دے ہی دیں گے۔ لیکن اگر یہ طرز اختیار کیا کہ مولوی تو حلال کو حرام کہتے ہی رہتے ہیں لہٰذا ان کی بات نہ مانو! تو یہ بڑا خطرناک نظریہ ہے اور اس سے توبہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ انسان گناہ کو گناہ سمجھ کر کرے اور اس پر نادم ہو یہ بہتر ہے اس بات سے کہ آدمی گناہ کرے اور اس پر سینہ زوری کرے۔ تو توبہ کا سب سے پہلا جزو ندامت ہے۔

توبہ کی دوسری شرط

توبہ کی دوسری شرط یہ ہے کہ جس عمل سے توبہ کر رہا ہے اس عمل کو فوراً ترک کر دے۔ یہ نہ ہو کہ زبان سے تو توبہ کر رہا ہے مگر اس وقت بھی اس گناہ میں مبتلا ہے جس سے توبہ کر رہا ہے۔ لہٰذا اس گناہ کو فوراً ترک کر دے۔

توبہ کی تیسری شرط

توبہ کا تیسرا جزو یہ ہے کہ اس بات کا پختہ عزم و ارادہ کر لے کہ آئندہ اس گناہ کے قریب بھی نہیں جاؤں گا۔ تو ان تین چیزوں کے پائے جانے سے توبہ مکمل ہو جائے گی اور سارے گناہ انشاء اللہ معاف ہو جائیں گے اور نامۂ اعمال صاف ہو جائے گا۔ جہاں تک پہلی دو چیزوں کا تعلق ہے یعنی ندامت اور فوری طور پر ترک کر دینا، یہ تو اکثر و بیشتر ایک مسلمان کو حاصل ہو ہی جاتی ہیں۔ جب تک ایک مسلمان کے دل میں ایمان کی چنگاری باقی ہے تب تک ان کی توفیق اس کو ہو

جائے گی۔ لیکن تیسری بات یعنی آئندہ اس گناہ کو نہیں کروں گا، اس میں شبہ ہوتا ہے کہ پتہ نہیں ارادہ پختہ ہوا کہ نہیں اور توبہ کامل ہوئی کہ نہیں۔

پختہ ارادے کے بارے میں شبہ کا حکم

ایک مرتبہ میں حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے یہی بات عرض کی کہ حضرت! توبہ کی جو ترغیب دلائی جاتی ہے، اس کے تین امور میں سے پہلے دو تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن تیسری بات میں شبہ رہتا ہے جس کی وجہ سے توبہ کامل نہیں رہتی۔ تو حضرت نے فرمایا کہ جب تم نے دل میں یہ ارادہ کر لیا کہ آئندہ نہیں کروں گا تو ارادہ پختہ ہو گیا اور یہ جو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ میں اس پر قائم بھی رہ سکوں گا یا نہیں تو یہ توبہ کے منافی نہیں، اپنی طرف سے ارادہ کی پختگی ضروری ہے۔ یہی بات حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے اپنے مواعظ میں لکھی ہے کہ عزم کے لیے علم غیب کا حکم تو نہیں دیا گیا کہ تمہیں اس بات کا علم ہونا چاہئے کہ آئندہ اس کو کرو گے یا نہیں۔ تم کو تو صرف عزم کا حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا اپنی طرف سے پختہ ارادہ کر لو! اور یہ بات کہ تم اس پر قائم بھی رہ سکو گے یا نہیں تو اس کا آسان علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس پر پختگی کی دعا مانگ لو۔

توبہ کرنے کا طریقہ

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جب ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کے حضور سچے دل سے، گڑگڑا کر، رو رو کر اور خشوع وخضوع سے توبہ کر لی تو اس کے بعد اپنی پچھلی زندگی میں کیے ہوئے گناہوں کو بھول جاؤ! اس لیے کہ اللہ

تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ میں توبہ کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہوں۔ لہٰذا اس وعدہ پر شک کرنا بھی برا ہے کہ اللہ نے معاف کر دیا اور تم ابھی تک شک ہی کر رہے ہو۔ اب آگے کی فکر کر کے اپنی زندگی کو سنوارو۔ البتہ صرف ایک بات ہے کہ توبہ سے وہ گناہ معاف ہوتے ہیں جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور جن کی تلافی ممکن نہیں۔ البتہ جن گناہوں کی تلافی ممکن ہے تو ان کی تلافی کرنا ہوگی اور اس کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی۔ مثلاً کسی کی نمازیں یا روزے رہ گئے ہیں یا زکوٰۃ ادا نہیں کی یا حج نہیں کیا تو چونکہ ان کی تلافی ممکن ہے اس لیے ان کی تلافی قضا کے ذریعے کرنا ہوگی۔ اور ساتھ ساتھ حقوق العباد کو بھی ادا کرنا ہوگا۔ اور وہ اس طرح کہ یا تو حق والوں سے اپنے حقوق معاف کرا لو اور یا پھر ان کے حقوق ادا کرو۔ یہ تو ہے اجمالی توبہ، اور اس کی تکمیل اس طرح سے ہوگی کہ جن جن باتوں کی تلافی ممکن ہے ان کی تلافی کی فکر کرو۔ مثلاً کسی کی نمازیں رہ گئیں ہیں اور وہ قضاء عمری کرنا چاہتا ہے تو اس کا حساب کر کے ایک کاپی میں لکھ لے اور ہر روز فرض نماز کے بعد وہی نماز ایک ایک کر کے لوٹانا شروع کر دے اور عشاء میں وتر کی بھی قضا کرے، اور کاپی میں یوں لکھ لے کہ میں نے اپنی نمازوں کی قضا فلاں تاریخ سے شروع کی اور اب تک اتنی نمازیں قضا کر چکا ہوں، یہاں تک کہ جتنے عرصے کی نمازیں باقی رہ گئی ہیں وہ پوری ہو جائیں۔ اور اگر تم نمازیں پوری نہ کر سکو تو وصیت کر دو کہ میرے ترکہ میں سے اتنی نمازوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے۔ ایسے ہی روزوں کا بھی حساب کر لیا جائے۔

اور ساتھ ساتھ حقوق العباد کو ادا کرنے کی بھی فکر کرو! مثلاً کسی سے قرض لے رکھا ہے تو وہ اس کو ادا کر دو! کسی کا پیسہ جان بوجھ کر دبا رکھا ہے تو وہ ادا کر

دو! اور اگر دوسرے حقوق ہیں مثلاً کسی کو جسمانی یا نفسیاتی یا ذہنی تکلیف دی ہے تو اس سے معافی مانگ لو! اور اس کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ اپنے سب تعلق والوں کو ایک خط لکھو کہ آپ سے میرا اتنے دنوں سے تعلق ہے، نجانے میں نے آپ کے کون کون سے حقوق ضائع کیے ہیں میں آپ سے للہ فی اللہ معافی مانگتا ہوں کہ میں نے آپ کے جو حقوق ضائع کیے ہیں مجھے معاف فرما دیجئے۔

ہمارے بزرگوں کے یہاں ایک بڑا اچھا جملہ تھا کہ جب دو آدمی مل کر رخصت ہوتے تو کہتے تھے کہ ''بھئی! کہا سنا معاف کر دینا'' تو اس سے سارا معاملہ صاف ہو جاتا تھا۔

توبہ کی دو قسمیں

حضرت حکیم الامت نے قصد السبیل میں لکھا ہے کہ ایک توبہ اجمالی ہوتی ہے اور ایک تفصیلی ہوتی ہے۔ اجمالی توبہ تو یہ ہے کہ دو رکعت صلوۃ التوبہ کے نام سے پڑھ لو اور اپنی پچھلی زندگی کے سارے گناہوں کو معاف کرا لو! حضور اقدس ﷺ اللہ سے اس طرح مغفرت طلب کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! میں ان چیزوں سے بھی توبہ کرتا ہوں جو مجھے معلوم ہیں اور ان سے بھی جو مجھے معلوم نہیں۔ یہ تو ہے اجمالی توبہ جس سے انشاء اللہ اکثر و بیشتر حساب تو صاف ہو جائے گا۔ اس کے بعد اب دیکھو کہ کوئی چیز تلافی کی باقی تو نہیں ہے اگر ہے تو اس کی تلافی کر دو۔

یہ آخرت کی طرف چلنے اور اپنی اصلاح کرنے کا پہلا قدم ہے۔ انسان اس پر عمل کر لے اور کم از کم اپنی پچھلی عمر کا حساب ہی صاف کر لے۔ اور ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ یہ عمل ہر روز کرنا چاہئے جیسا کہ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ بھئی! کچھ بھی تو مشکل نہیں بس رات کو سونے سے پہلے حساب صاف کر لیا کرو!

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ عارفی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ کلمہ طیبہ پڑھ لو، توبہ استغفار کرلو اور سو جاؤ اگر موت آگئی تو انشاء اللہ سیدھے جنت میں جاؤ گے۔

عربی زبان میں توبہ کے معنی ہیں 'لوٹنا' تو مطلب یہ ہوا کہ جب آدمی توبہ کرتا ہے تو اس سے پہلے وہ اللہ کے راستے سے کہیں دور نکل گیا تھا اب توبہ کے ذریعے لوٹ آیا ہے۔ اور صراط مستقیم کی خصوصیت ہے کہ وہ انسان کے اندر استقامت کا مادہ پیدا کرتا ہے اور پھر وہ سیدھے راستے پر آسانی سے چلتا رہتا ہے۔

یہ ایک نسخہ ہے جو کہ پوری زندگی کے گناہوں کو معاف کرانے کے لیے ہے۔ جب اس کو استعمال کرلیں تو پھر روزانہ اس کی تجدید کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توبہ کی اصل روح سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں اور ہم سب کو سچی توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

اسلام اور عقل

موضوع = اسلام اور عقل
بیان = جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ
ضبط و ترتیب = مولانا خالد محمود (فاضل جامعہ اشرفیہ، لاہور)
باہتمام = محمد ناظم اشرف
ناشر = بیت العلوم۔ ۲۰ نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی، لاہور
فون: ۷۳۵۲۴۸۳

﴿اسلام اور عقل﴾

حاضرین گرامی:

میرے لئے اس اکیڈمی کے مختلف تربیتی کورسوں میں حاضری کا پہلا موقع نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی جو تربیتی کورس منعقد ہوتے رہے ہیں ان میں بھی حسب فرمائش گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے اس مرتبہ بھی مجھ سے یہ فرمائش کی گئی کہ میں اسلامائزیشن آف لاز کے سلسلے میں آپ حضرات سے کچھ گفتگو کروں، اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ اسلامائزیشن آف لاز کا موضوع بڑا طویل اور ہمہ گیر ہے لیکن اس مختصر سے وقت میں اسلامائزیشن آف لاز کے صرف ایک پہلو کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

اسلامائزیشن پر طعنہ زنی

جب یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ ہمارا قانون، ہماری معیشت، سیاست یا ہماری زندگی کا ہر پہلو اسلام کے سانچے میں ڈھلنا چاہئے تو خیال یہ پیدا ہوتا ہے

کہ آخر اس کی دلیل کیا ہے؟ اس خیال کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آج ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں سیکولر تصورات دنیا کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں اور یہ بات حقیقت مسلمہ کے طور پر تقریباً ساری دنیا میں مان لی گئی ہے کہ کسی ریاست کے چلانے کا بہترین سسٹم سیکولر سسٹم ہے اور اسی سیکولر ازم کے دائرہ میں رہتے ہوئے ریاست کو کامیابی کے ساتھ چلایا جا سکتا ہے ایسے ماحول میں جہاں دنیا کی بیشتر ریاستیں بڑی سے لے کر چھوٹی تک نہ صرف سیکولر ہونیکا دعویٰ کرتی ہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتی ہیں اس قسم کے معاشرے میں یہ آواز بلند کرنا کہ ہمیں اپنے ملک اپنے قانون اور اپنی معیشت و سیاست غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے کو اسلامائز کرنا چاہئے جس کے معنی بالفاظ دیگر یہ لئے جاتے ہیں کہ معاشرے کو چودہ سو سال پرانے اصولوں کے ماتحت چلانا چاہئے تو یہ آواز آج کی اس دنیا میں اجنبی اور اچنبھی معلوم ہوتی ہے اور اس کو طرح طرح کے طعنوں سے نوازا جاتا ہے فنڈامینٹل ازم یعنی بنیاد پرستی کی اصطلاح ان لوگوں کی طرف سے ایک گالی بنا کر دنیا میں مشہور کر دی گئی ہے فنڈامینٹل ازم کا معنی یہی ہے کہ ریاست کا نظام دین و اسلام کے تابع ہونا چاہئے حالانکہ اگر اس لفظ کے اصل معنی پر غور کیا جائے تو یہ کوئی برا لفظ نہیں تھا فنڈامینٹلسٹ کے معنی ہیں کہ جو بنیادی اصولوں کو اختیار کرنے والا ہو لیکن اس لفظ کو گالی بنا کر مشہور کر دیا گیا۔

اپنی زندگی کو اسلامائز کیوں کریں؟

ہم اپنی زندگی کو آخر کیوں اسلامائز کریں اور ہم اپنے قوانین کو اسلام کے سانچے میں کیوں ڈھالنا چاہتے ہیں؟ حالانکہ دین کی تعلیمات چودہ سو سال پرانی ہیں۔

ہمارے پاس عقل اور تجربہ موجود ہے

اس موقع پر میں جس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سیکولر ریاست جسے لادینی ریاست کہا جائے وہ اپنے نظام حکومت اور نظام زندگی کو کس طرح چلائے؟ اس کے بارے میں کوئی اصولی بات نہیں کہی جا سکتی لیکن کہا یہ جاتا ہے ہمارے پاس عقل، مشاہدہ اور تجربہ موجود ہے جن کے بل بوتے پر ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہماری اس دور کی ضروریات اور تقاضے کیا ہیں؟ اور اس کے لحاظ سے کیا چیز ہماری مصلحت کے مطابق ہے؟ اور اسی مصلحت کے مطابق ہم اپنے قوانین کو ڈھال سکتے ہیں اور اس بدلتے ہوئے حالات میں ہم ان قوانین کے اندر تبدیلی لا سکتے ہیں اور ترقی کر سکتے ہیں۔

کیا عقل انسانیت کی راہنمائی کیلئے کافی ہے؟

اس سیکولر نظام حکومت میں عقل، تجربے اور مشاہدے کو آخری معیار قرار دے دیا گیا ہے۔ کیا یہ معیار واقعتہً اس لائق ہے کہ قیامت تک آنے والی انسانیت کی راہنمائی کر سکے؟ تنہا عقل مشاہدے اور تجربے کے بھروسے پر یہ معیار کتنا مضبوط ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کوئی بھی نظام جب تک اپنے پیچھے علمی حقائق اور اصولوں کا سرمایہ نہ رکھتا ہو اس وقت تک وہ کامیابی سے نہیں چل سکتا۔

حصول علم کے تین ذرائع

کسی بھی چیز کو حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے تین ذرائع عطا

فرمائے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص دائرہ کار ہے جہاں تک وہ ذریعہ کام دیتا ہے اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے مگر اس سے آگے اس ذریعہ علم سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

پہلا ذریعہ حواس خمسہ

انسان کو سب سے پہلا جو ذریعہ علم عطا ہوا ہے وہ اس کے حواس خمسہ ہیں، آنکھ، کان، ناک وغیرہ چنانچہ آنکھ کے ذریعہ بہت سی چیزوں کا علم دیکھ کر، کان کے ذریعہ سن کر، اور ناک کے ذریعہ سونگھ کر، اور اسی طرح ہاتھ کے ذریعہ چھو کر، حاصل ہوتا ہے لیکن یہ پانچ ذرائع علم جو مشاہدے کی سرحد میں آتے ہیں ان میں سے ہر ایک کا محدود دائرہ ہے جس سے باہر وہ ذریعہ کام نہیں کرتا آنکھ دیکھ سکتی ہے لیکن سن نہیں سکتی، کان سن سکتا ہے لیکن دیکھ نہیں سکتا، ناک سونگھ سکتی ہے دیکھ نہیں سکتی، اگر کوئی یہ چاہے کہ میں آنکھ تو بند کر لوں اور کان سے دیکھنا شروع کر دوں۔ تو اس کو ساری دنیا احمق کہے گی، اس لئے کہ کان اس لئے بنایا ہی نہیں گیا اگر کوئی یہ کہے تمہارا کان نہیں دیکھ سکتا، اس لئے کہ کان کو دیکھنے میں استعمال کرنا بے کار ہے جواب میں وہ یہ کہے کہ اگر کان دیکھ نہیں سکتا تو وہ بے کار چیز ہے ایسا شخص احمق ہے، اس لئے کہ وہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ کان کا ایک دائرہ کار ہے ایک حد تک وہ کام کرے گا اس سے اگر آنکھ کا کام لینا چاہو گے تو وہ نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حصول علم کے یہ جو حواس خمسہ عطا فرمائے ہیں ایک مرحلہ پر جا کر ان سب کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔

دوسرا ذریعہ ”عقل“

پانچوں حواس کا دائرہ محدود ہے اس دائرے کے باہر کے مرحلہ پر نہ تو

آنکھ کام دیتی ہے نہ کان کام دیتا ہے نہ زبان کام دیتی ہے نہ ہاتھ کام دیتا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو براہ راست مشاہدے کی گرفت میں نہیں آتیں، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو علم کا ایک اور ذریعہ عطا فرمایا، اور وہ ہے عقل۔ جو چیزیں حواس خمسہ کے دائرے سے باہر ہوں وہاں عقل رہنمائی کرتی ہے مثال کے طور پر میرے سامنے یہ میز رکھی ہے میں آنکھ سے دیکھ کر یہ بتا سکتا ہوں کہ اس کا رنگ کیا ہے ہاتھ سے چھو کر معلوم کر سکتا ہوں کہ اس کی لکڑی سخت ہے اس پر فارمیکا لگا ہوا ہے لیکن یہ میز وجود میں کیسے آئی یہ بات میں نہ تو آنکھ سے دیکھ کر بتا سکتا ہوں اور نہ کان سے سن کر اور نہ زبان سے چکھ کر بتا سکتا ہوں اس لئے کہ اس کے بننے کا پروجیکٹ میرے سامنے نہیں ہوا۔ اس موقع پر عقل میری رہنمائی کرتی ہے کہ یہ چیز اتنی صاف ستھری بنی ہوئی ہے خود بخود یہ چیز وجود میں نہیں آ سکتی اس کو کسی اچھے ماہر تجربہ کار کارپینٹر نے بنایا ہے لہٰذا یہ بات کہ اس کو کسی کارپینٹر نے بنایا ہے میری عقل نے بتائی ہے تو اس موقع پر کہ جہاں حواس خمسہ کام کرنا چھوڑ گئے تھے وہاں عقل نے میری رہنمائی کی۔

عقل کا دائرہ محدود ہے

لیکن جس طرح ان پانچ حواس کا دائرہ کار لامحدود نہیں تھا بلکہ وہ ایک حد پر جا کر ختم ہو گیا اسی طرح عقل کا دائرہ بھی لامحدود نہیں ہے وہ بھی ایک حد تک انسان کو کام دیتی ہے اور ایک حد تک ہی رہنمائی کرتی ہے اس سے آگے جا کر اگر آپ اس کو استعمال کرنا چاہیں گے تو عقل صحیح جواب نہیں دے گی اور صحیح رہنمائی بھی نہیں کرے گی۔

تیسرا ذریعہ ''وحی''

جس جگہ عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے وہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو ایک تیسرا ذریعہ علم عطا فرمایا ہے اور وہ ہے وحی الٰہی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے یہ آسمانی تعلیم شروع ہی اس جگہ سے ہوتی ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے لہٰذا جس جگہ ''وحی الٰہی'' آتی ہے اس جگہ عقل کو استعمال کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ آنکھ کے کام کے لئے کان کو استعمال کرنا اور کان کے کام کے لئے آنکھ کو استعمال کرنا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عقل بے کار ہے بلکہ عقل کار آمد چیز ہے بشرطیکہ اس کو آپ اس کے دائرہ میں استعمال کریں۔ اگر اس کو باہر استعمال کریں گے تو ایسا ہی ہوگا جیسے کہ کوئی شخص آنکھ اور کان سے سونگھنے کا کام لے۔

اسلام اور سیکولر نظام حیات میں بنیادی فرق

اسلام میں اور سیکولر نظام حیات میں یہی فرق ہے کہ سیکولر ازم کے حامی پہلے دو ذریعہ علم کو اختیار کر کے وہاں جا کر رک جاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انسان کے پاس کوئی تیسرا ذریعہ علم کا نہیں ہے۔ بس ہماری ناک، کان، آنکھ اور ہماری عقل ہے۔ آگے کوئی اور ذریعہ علم نہیں ہے اور اسلام یہ کہتا ہے کہ یہاں یہ بات رکتی نہیں اس سے آگے ایک اور ذریعہ علم تمہارے پاس ہے اور وہ ہے ''وحی الٰہی'' اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کا یہ دعویٰ کہ عقل کے ذریعہ ساری باتیں معلوم نہیں کی جا سکتیں بلکہ آسمانی ہدایت کی ضرورت ہے، وحی الٰہی کی ضرورت ہے، پیغمبروں اور رسولوں اور آسمانی کتابوں کی ضرورت ہے اور یہ دعویٰ ہمارے موجودہ معاشرے میں کس حد تک درست ہے؟

عقل کا فریب

آج کل عقل پرستی کا بڑا زور ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ہر چیز کو عقل کی میزان پر تول کر اور پرکھ کر اختیار کریں گے لیکن عقل کے پاس کوئی ایسا لگا بندھا فارمولا اور کوئی لگا بندھا اصول نہیں ہے جو عالمی حقیقت رکھتا ہو جس کو ساری کائنات کے لوگ تسلیم کرلیں اور اس کے ذریعہ وہ اپنے خیر وشر اور اچھائی برائی کا معیار تجویز کرسکیں کہ اچھی اور بری کیا چیز ہے؟ کونسی چیز اختیار کرنی چاہئے اور کونسی چیز اختیار نہیں کرنی چاہئے؟ جب ہم یہ فیصلہ عقل کے حوالے کرتے ہیں تو آپ انسانیت کی پوری تاریخ دیکھ جایئے اس میں آپ کو یہ نظر آئے گا کہ عقل نے انسان کو اس معاملے میں اتنے دھوکے دیئے ہیں کہ جس کا شمار اور حد وحساب ممکن نہیں۔ اگر عقل کو ''وحی الٰہی'' کی رہنمائی سے آزاد چھوڑ دیا جائے تو انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے اس لئے تاریخ کی دو تین چھوٹی سی مثالیں عرض کرتا ہوں۔

عقل کی بنیاد پر بہن سے نکاح کا جواز

آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے مسلمانوں میں ایک فرقہ پیدا ہوا تھا اس کو باطنی فرقہ اور قرامطہ کہتے ہیں اس کا ایک مشہور لیڈر ہے جس کا نام عبید اللہ بن حسن قیروانی ہے۔ اس نے اپنے پیروؤں کے نام ایک بڑا دلچسپ خط لکھا کہ میری سمجھ میں یہ بے عقلی کی بات نہیں آتی کہ لوگوں کے پاس اپنے گھر میں ایک بڑی خوبصورت سلیقہ شعار لڑکی بہن کی صورت میں موجود ہے اور وہ بھائی کے مزاج کو بھی سمجھتی ہے اس کی نفسیات سے بھی واقف ہے مگر یہ بے عقل انسان اس بہن کا ہاتھ کسی اجنبی شخص کو پکڑا دیتا ہے جس کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کے

ساتھ نباہ صحیح ہو سکے گا یا نہیں؟ مزاج سے واقف ہے یا نہیں؟ اور خود اپنے لئے بعض اوقات ایسی لڑکی لے آتا ہے جو حسن و جمال سلیقہ شعاری اور مزاج شناسی کسی اعتبار سے بھی اس بہن کے ہم پلہ نہیں ہوتی میری سمجھ میں اس بے عقلی کا جواز نہیں آتا کہ اپنے گھر کی دولت کو دوسرے کے ہاتھ میں دے دے اور اپنے پاس ایک ایسی چیز لے آئے جو اس کو پوری طرح آرام و راحت نہ دے۔ یہ بات عقل کے خلاف ہے لہٰذا میں اپنے پیروؤں کو نصیحت کرتا ہوں کہ اس بے عقلی سے اجتناب کریں اور اپنے گھر کی دولت کو گھر ہی میں رکھیں۔

(الفرق بین الفرق للبغدادی ص ۲۹۷، و بیان مذاہب الباطنیہ للدیلمی ص ۸۱)

عقل کی بنیاد پر اپنے پیرووں کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ جب ایک بہن اپنے بھائی کے لئے کھانا پکا سکتی ہے اس کی بھوک دور کر سکتی ہے اس کی راحت کے لئے اس کے کپڑے اس کا بستر درست کر سکتی ہے تو اس کی جنسی تسکین کا سامان کیوں نہیں کر سکتی؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ عقل کے خلاف ہے۔

خالص عقل کی بنیاد پر جواب نہیں دیا جا سکتا

آپ اس کی بات پر جتنی چاہیں لعنت بھیجیں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ خالص عقل کی بنیاد جو وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد ہو اور جس کو وحی الٰہی کی روشنی میسر نہ ہو اس کے اس استدلال کا جواب قیامت تک نہیں دیا جا سکتا اگر کوئی یہ کہے یہ تو بڑی بداخلاقی اور بڑی گھناؤنی بات ہے تو اس کا جواب موجود ہے کہ یہ بداخلاقی اور گھناؤنا پن یہ سب ماحول کے پیدا کردہ تصورات ہیں آپ ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوئے ہیں جہاں اس کو معیوب سمجھا جاتا ہے اس لئے آپ اس کو معیوب سمجھتے ہیں۔ اگر آپ یہ کہیں کہ اس سے نسب کا سلسلہ خراب ہو جاتا ہے تو

نسب کا سلسلہ خراب ہونے کے بارے میں جواب یہ ہے اس میں کیا خرابی ہے؟ نسب کا تحفظ کونسا ایسا عقلی اصول ہے جس کی وجہ سے نسب کا تحفظ ضرور کیا جائے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ اس سے طبی طور پر نقصانات ہوتے ہیں اس لئے یہ بات سامنے آئی ہے کہ استلذ اذ بالاقارب سے طبی نقصان ہوتے ہیں اگر آپ کو معلوم ہو کہ مغربی دنیا میں اس موضوع پر کتابیں آ رہی ہیں کہ استلذ اذ بالا قارب انسان کی فطری خواہش کا ایک حصہ ہے اور اس کے جو طبی نقصانات بیان کئے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں وہی نعرہ جو عبیداللہ بن حسن قیروانی نے آج سے آٹھ سو سال پہلے لگایا تھا آج نہ صرف اس کی صدائے بازگشت ہے بلکہ مغربی ملکوں میں اس پر عمل بھی ہو رہا ہے۔

عقل کو وحی الٰہی سے آزاد کرنے کا نتیجہ

ایسا آخر کیوں ہے؟ اس لئے کہ عقل کو اس جگہ استعمال کیا جا رہا ہے جو درحقیقت عقل کا دائرہ نہیں ہے جہاں وحی الٰہی کی رہنمائی کی ضرورت ہے وہاں عقل کو وحی الٰہی سے بے نیاز ہو کر استعمال کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ ہم جنس پرستی کا بل تالیوں کی گونج میں منظور کر رہی ہے بلکہ امریکہ میں تو باقاعدہ یہ ایک علم بن گیا ہے۔ میں ایک مرتبہ اتفاق سے نیو یارک کے کتب خانہ میں گیا تو وہاں پورا ایک سیکشن تھا جس پر یہ عنوان لگا ہوا تھا جس کے اوپر کتابوں کا ایک ذخیرہ آ گیا ہے اور باقاعدہ ان کی انجمنیں ہیں۔ ان کے گروپ ہیں اور بڑے بڑے عہدوں پر ایسے لوگ فائز ہیں۔ اس زمانے میں نیو یارک کا میئر بھی ایک ہم جنس پرست تھا۔

عقلی اعتبار سے کوئی خرابی نہیں

ابھی پچھلے ہفتے کے رسالہ ٹائم کو آپ اٹھا کر دیکھیں تو اس میں یہ خبر آئی ہے کہ خلیج کی جنگ میں حصہ لینے والے فوجیوں میں سے تقریباً ایک ہزار افراد کو صرف اس لئے فوج سے نکال دیا گیا کہ وہ جنس پرست تھے تو اس پر شور مچ رہا ہے، مظاہرے ہو رہے ہیں اور چاروں طرف سے یہ آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ یہ بات کہ ہم جنس پرست ہونے کی وجہ سے آپ نے ان لوگوں کو عہدے سے برخاست کر دیا، یہ بات عقل کے خلاف ہے اور ایسے لوگوں کو دوبارہ بحال کرنا چاہئے۔ اور یہ بات بھی عقل کی بنیاد پر ہو رہی ہے۔کیا آپ باخبر ہیں کہ عقل انسان کو کس کس جگہ لے جا رہی ہے آج ہیومن ارج کا بہانہ لے کر دنیا کی ہر بری سے بری بات کو جائز قرار دیا جا رہا ہے اور یہ تو ہوموفیسیلٹی کی بات تھی اب تو بات جانوروں، کتوں، گدھوں اور گھوڑوں تک پہنچ گئی اور اس کو بھی باقاعدہ فخریہ بیان کیا جا رہا ہے۔

عقل کی خرابی کی واضح مثال

مزید وضاحت کے لئے ایک اور مثال عرض کر دوں کہ آج ساری دنیا ایٹم بم کی تباہ کاریوں سے خوف زدہ ہے اور ایٹمی اسلحہ میں تخفیف کے طریقے تلاش کر رہی ہے اس پر انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کا مقالہ ذرا کھول کر دیکھیں اس میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ایٹم بم کا تجربہ دنیا میں دو جگہ کیا گیا ایک ہیروشیما دوسرا ناگاساگی ان دونوں مقامات پر ایٹم بم سے جو تباہی مچی اس کا ذکر تو بعد میں کیا لیکن یہ مقالہ شروع یہاں سے کیا گیا ہے کہ ہیروشیما اور ناگاساگی پر جو ایٹم بم

برسائے گئے اس کے ذریعے ایک کروڑ انسانوں کی جانیں بچائی گئیں اور منطق یہ بتائی ہے کہ اگر ہیروشیما اور ناگاساگی پر بم نہ برسائے جاتے تو جنگ جاری رہتی اور اس میں تخمینہ یہ تھا کہ تقریباً ایک کروڑ آدمی مزید مریں گے۔ تو ایٹم بم کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے کہ ایٹم بم وہ چیز ہے جس کے ذریعے ایک کروڑ انسانوں کی جانیں بچائی گئیں یہ اس واقع کا جواز ہے جس پر ساری دنیا لعنت بھیجتی ہے کہ اس ایٹم بم کے ذریعے ہیروشیما اور ناگاساگی میں بچوں کی نسلیں تباہ کر دی گئیں اور بے گناہوں کو اس طریقے سے مارا گیا ہے لیکن اس کی بھی خالص عقل کی بنیاد پر ہے لہٰذا کوئی بری سے بری بات اور سنگین سے سنگین خرابی ایسی نہیں ہے جس کے لئے عقل کوئی نہ کوئی دلیل اور جواز فراہم نہ کرے۔ سیاست کی دنیا میں ہٹلر اور مسولینی کا نام ایک گالی بن گیا ہے لیکن آپ ذرا ان کا فلسفہ تو اٹھا کر دیکھیں کہ انہوں نے فاشزم کو کس طرح فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے ایک معمولی سمجھ کا آدمی اگر فاشزم کے فلسفے کو پڑھے گا تو کہے گا کہ بات تو معقول ہے اور بات سمجھ میں آتی ہے تو عقل ان کو اس طرف لے جا رہی ہے۔ دنیا کی کوئی بد سے بدتر برائی ایسی نہیں ہے جس کو عقل کی دلیل کی بنیاد پر تسلیم کرانے کی کوشش نہ کی جاتی ہو اس طرح عقل کو اس جگہ استعمال کیا جا رہا ہے جہاں اس کے استعمال کی جگہ نہیں ہے۔

عقل کی مثال ابن خلدون کی نظر میں

علامہ ابن خلدون جو بہت بڑے مورخ اور فلسفی گزرے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عقل دی ہے وہ بڑے کام کی چیز ہے لیکن یہ اسی وقت تک کام کی چیز ہے جب اس کو اس کے اپنے دائرے میں استعمال کیا جائے اگر اس کو اس کے دائرے سے باہر استعمال کریں تو یہ کام نہیں دے گی اور پھر اس کی

بڑی مثال دی ہے کہ عقل کی مثال ایسی ہے جیسے سونا تولنے کا کانٹا وہ چند گرام تول لیتا ہے اور وہ اس حد تک کام دیتا ہے کہ وہ صرف سونا تولنے کے لئے بنایا گیا ہے اگر کوئی شخص اس سونے کے کانٹے میں پہاڑ کو تولنا چاہے گا تو اس کے نتیجے میں وہ کانٹا ٹوٹ جائے گا۔ تو اب اگر کوئی شخص کہے کہ یہ کانٹا تو بیکار چیز ہے اس لئے کہ اس سے پہاڑ تلتا نہیں ہے اس نے تو کانٹے کو ہی توڑ دیا۔ بات درحقیقت یہ ہے اس نے اس کانٹے کو غلط جگہ اور غلط کام میں استعمال کیا اس لئے وہ کانٹا ٹوٹ گیا۔

(مقدمہ ابن خلدون بحث علم کلام ص ۴۴۰)

عقل کے استعمال میں اسلام اور سیکولرازم کا اختلاف

اسلام اور سیکولر ازم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام یہ کہتا ہے بے شک تم عقل کو استعمال کرو لیکن اس حد تک جہاں تک وہ کام دے۔ ایک سرحد ایسی آتی ہے جہاں عقل انسان کو کام دینا چھوڑ دیتی ہے بلکہ جواب غلط دینا شروع کر دیتی ہے جیسے آج کی دنیا کمپیوٹر کی دنیا ہے اگر اس کو جس کام کے لئے بنایا اس کے لئے استعمال کریں تو وہ فوراً جواب دے دے گا لیکن جو چیز اس میں فیڈ نہیں کی گئی اگر اس سے وہ چیز معلوم کرنا چاہیں، نہ صرف یہ کہ وہ کام نہیں کرے گا بلکہ غلط جواب دینا شروع کر دے گا اسی طرح جو چیز عقل کے اندر فیڈ نہیں کی گئی، جس چیز کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک تیسرا ذریعہ علم عطا فرمایا وہ ہے ''وحی الٰہی'' جب وہاں اس کو استعمال کریں گے تو یہ غلط جواب دینا شروع کر دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جس کے لئے نبی کریم ﷺ تشریف لائے، جس کے لئے قرآن مجید اتارا گیا، چنانچہ قرآن کریم کی آیت ہے ''انا انزلنا الیك الکتاب بالحق لتحکم بین

الناس" (سورہ نساء ۱۰۵) ہم نے آپ کے پاس یہ کتاب اس واسطے اتاری ہے تاکہ آپ حق کے ساتھ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اور یہ قرآن مجید آپ کو بتائے گا حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے؟ اور یہ بھی بتائے گا صحیح کیا ہے اور غلط کیا؟ خیر کیا ہے اور شر کیا؟ یہ بات آپ کی محض عقل کی بنیاد پر نہیں معلوم ہوسکتی۔

آزادی فکر کا ایک مشہور ادارہ

ایک معروف و مشہور ادارہ جس کا نام "ایمنسٹی انٹرنیشنل" ہے اس کے ایک ریسرچ اسکالر کچھ سروے کرنے کے لئے پاکستان آئے ہوئے تھے تو وہ نہ جانے کیوں میرے پاس انٹرویو کرنے کے لئے بھی آگئے انہوں نے مجھ سے آکر کہا کہ اصل میں ہمارا مقصد یہ ہے کہ "آزادی فکر یہ ہمارا بنیادی کام ہے جس کے تحت ہم کام کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگ ہیں جو اپنی آزادی فکر کی وجہ سے جیل اور قید میں ہیں، ان کو نکالنا چاہتے ہیں اور یہ ایک ایسا غیر متنازعہ موضوع ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہونا چاہئے مجھے اس لئے پاکستان بھیجا گیا کہ میں اس موضوع پر مختلف طبقوں کے خیالات معلوم کروں، میں نے سنا ہے کہ آپ کا بھی مختلف اہل دانش سے تعلق ہے اس لئے میں آپ سے بھی کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔

ناتمام اور غیر سنجیدہ سروے

میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ یہ سروے کس مقصد سے کرنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے مختلف

حلقوں میں اس سلسلے میں کیا کیا رائے پائی جاتی ہے، میں نے پوچھا کہ آپ کراچی کب تشریف لائے؟ جواب دیا کہ آج صبح، میں نے پوچھا کہ کب تشریف لے جائیں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ کل صبح میں اسلام آباد جا رہا ہوں (رات کے وقت یہ ملاقات ہو رہی تھی) اسلام آباد میں کتنے دن قیام رہے گا؟ فرمایا کہ ایک دن اسلام آباد میں رہوں گا میں نے پوچھا پھر کہاں جائیں گے؟ کہا کہ لاہور جاؤں گا میں نے ان سے کہا کہ پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ پاکستان کے مختلف حلقوں کے خیالات کا سروے کرنے جا رہے ہیں اور اس کے بعد آپ رپورٹ تیار کر کے پیش کریں گے، آپ کا کیا خیال ہے کہ ان دو تین شہروں میں دو تین دن گزارنا آپ کے لئے کافی ہوگا؟ کہنے لگے ظاہر ہے کہ تین دن میں سب کے خیالات معلوم نہیں ہو سکتے لیکن میں مختلف حلقہ ہائے فکر سے مل رہا ہوں کچھ لوگوں سے میری ملاقاتیں ہوئی ہیں اور اسی سلسلے میں آپ کے پاس بھی آیا ہوں، آپ بھی میری کچھ رہنمائی فرمائیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آج آپ نے کراچی میں کتنے لوگوں سے ملاقات کی؟ کہنے لگے میں نے تین آدمیوں سے ملاقات کر لی ہے اور چوتھے آپ ہیں میں نے کہا کہ آپ ان چار آدمیوں کے خیالات معلوم کر کے رپورٹ تیار کر دیں گے کہ کراچی والوں کے یہ خیالات ہیں معاف کیجئے مجھے آپ کے اس سروے کی سنجیدگی پر شبہ ہے اس لئے کہ تحقیقی سروے کا کوئی کام اس طرح نہیں ہوا کرتا اس لئے میں آپ کے کسی سوال کا جواب دینے سے معذور ہوں اس پر وہ معذرت کرنے لگے کہ میرے پاس وقت کم تھا اس لئے صرف چند حضرات سے مل سکا ہوں احقر نے عرض کیا کہ وقت کی کمی کی صورت

میں سروے کے اس کام کو ذمے لینا کیا ضروری تھا؟ پھر انہوں نے اصرار شروع کر دیا کہ اگرچہ آپ کا اعتراض درست ہے لیکن میرے چند سوالات کا جواب تو دے دیں احقر نے پھر معذرت کی اور عرض کیا کہ میں اس غیر سنجیدہ اور ناتمام سروے میں کسی بھی تعاون سے معذور ہوں۔

آزادی فکر پر کوئی قید یا پابندی ہونی چاہئے

البتہ میں آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں کیونکہ آپ عالمی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں اور میں اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں انہوں نے کہا ٹھیک ہے میں نے ان سے کہا کہ آپ نے فرمایا کہ یہ ادارہ آزادی فکر کا علمبردار ہے بیشک یہ آزادی فکر بڑی اچھی بات ہے لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ آزادی فکر آپ کی نظر میں بالکل مطلق ہے یا اس پر کوئی پابندی ہونی چاہئے؟ جو بھی انسان کی سوچ میں آئے اور سمجھ میں آئے وہ دوسروں کے سامنے کہنے کے لئے آزاد ہو کوئی اس پر قید و بند نہ ہو کیا آپ ایسی آزادی فکر چاہتے ہیں یا کہ کوئی قید یا کوئی پابندی آزادی فکر کے اوپر آپ کی نظر میں ہونی چاہئے؟ کہنے لگے میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا میں نے کہا کہ آزادی فکر کا جو تصور ہے کیا وہ اتنا مطلق العنان ہے کہ انسان جو چاہے برملا کہے اور اس کی تبلیغ کرے اور لوگوں کو اس کی دعوت دے؟ مثلاً میری سوچ یہ کہتی ہے کہ سرمایہ داروں نے بہت دولت جمع کر لی ہے اس لئے غریبوں کو یہ آزادی ہونی چاہئے کہ وہ ان سرمایہ داروں پر ڈاکے ڈالیں اور میں اس کی تبلیغ کروں کہ غریبوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جاکر ڈاکہ

ڈالیں اور کوئی ان کو پکڑنے والا نہ ہو اس لئے کہ سرمایہ داروں نے ان کا خون چوس کر یہ دولت جمع کی ہے اب آپ بتائیں کہ آپ اس آزادی فکر کے حامی ہوں گے یا نہیں؟ وہ کہنے لگے اس کے تو ہم حامی نہیں ہوں گے۔

آزادی فکر کی حدود کیا ہوں؟

میں نے کہا میرا بھی یہی مقصد ہے کہ جب آزادی فکر اب سلوٹ (علی الاطلاق) نہیں ہے تو کیا اس پر کچھ قیدیں ہونی چاہیئے؟ تو کہنے لگے کچھ قیدیں تو ہونی چاہیں تو میں نے پوچھا کچھ قیدیں کیا ہونی چائیں؟ اور کون کیا فیصلہ کرے گا وہ قیدیں ہونی چاہیں؟ آپ کے پاس وہ کیا معیار ہے جس کی بنیاد پر آپ یہ فیصلہ کریں کہ فلاں قسم کی پابندی آزادی فکر پر لگائی جا سکتی ہے فلاں قسم کی نہیں لگائی جا سکتی؟ اس نے کہا کہ ہم نے اس پہلو پر غور تو نہیں کیا، میں نے کہا آپ اتنے بڑے عالمی ادارے سے وابستہ ہیں اور اس کام کے لئے سروے کرنے جا رہے ہیں آزادی فکر کا بیڑہ اٹھایا ہے لیکن یہ بنیادی سوال کہ آزادی فکر کی حدود کیا ہونی چاہیں اس کا اسکوپ کیا ہونا چاہیے، اگر یہ آپ کے ذہن میں واضح نہیں ہے تو یہ پروگرام بار آور نظر نہیں آتا اس سوال کا جواب آپ مجھے اپنے لٹریچر سے فراہم کر دیں۔ یا دوسرے حضرات سے مشورہ کر کے فراہم کر دیں کہنے لگے کہ آپ کے یہ خیالات اپنے ادارے تک پہنچاؤں گا اور اس موضوع پر جو ہمارا لٹریچر ہے وہ بھی فراہم کروں گا میں نے ان سے چلتے ہوئے یہ عرض کیا آپ سے جو سوال کیا تھا اس کا جواب ابھی تک مجھے تسلی بخش نہیں ملا لیکن امکان کے طور پر میں آپ سے

ایک بات کہتا ہوں اس پر بھی سوچ لیجئے گا وہ یہ کہ آپ قیامت تک کوئی ایسا معیار جو عالمی طور پر قابل قبول ہو پیش نہیں کر سکتے اس لئے کہ آپ ایک معیار متعین کریں گے دوسرا آدمی دوسرا معیار متعین کرے گا آپ کا بھی اپنے ذہن کا سوچا ہوا ہوگا اس کا بھی اپنے ذہن کا کچھ اور سوچا ہوا ہوگا دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو ایسا معیار تجویز کر دے جو ساری دنیا کے لئے قابل قبول ہو۔

وحی الٰہی ہی معیار بن سکتا ہے

لہٰذا میں یہ بات بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ واقعتہً انسانیت کے پاس وحی الٰہی کے سوا کوئی معیار نہیں ہے جو ان مبہم تصورات پر جائز حدیں قائم کرنے کا کوئی لازمی معیار فراہم کر سکے اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہدایت کے سوا انسان کے پاس کوئی اور چیز نہیں ہے۔

مذہب ہی معیار بن سکتا ہے

آپ فلسفہ قانون کو اٹھا کر دیکھئے اس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہے کہ قانون کا اخلاق سے کیا تعلق ہے فلسفہ قانون کے ایک مکتبہ فکر کا کہنا یہ ہے کہ قانون کا اخلاق سے تعلق نہیں ہے اور اچھے برے کا تصور ہی غلط ہے کوئی چیز نہ اچھی ہے اور نہ کوئی بری ہے وہ کہتا ہے ضروری غیر ضروری اور وغیرہ الفاظ درحقیقت انسان کی خواہشات نفس کے پیدا کردہ ہیں ورنہ اس قسم کا کوئی تصور حقیقی طور پر نہیں ہے اس واسطے معاشرہ جس وقت جو راستہ اختیار کرے وہ اس کے لئے درست ہے اور ہمارے پاس کوئی ایسا معیار نہیں ہے مشہور ٹیکسٹ بک کے آخر میں اس نے یہ

جملہ لکھا ہے کہ انسانیت کے پاس ایک چیز معیار بن سکتی تھی وہ ہے مذہب، لیکن مذہب کا تعلق انسان کی بلیف اور عقیدے سے ہے اور سیکولر نظام حیات میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے اس واسطے ہم اس کو بطور بنیاد کے اپنا نہیں سکتے۔

برطانیہ میں پارلیمنٹ کا بل کیوں پاس ہوا؟

ایک اور مثال یاد آئی جیسے میں نے عرض کیا تھا برطانیہ کی پارلیمنٹ میں ہم جنسی کا بل پاس ہوا بل پاس ہونے سے پہلے کافی مخالفت ہوئی اور اس بل کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو اس مسئلہ پر غور کرے کہ یہ بل پاس ہونا چاہئے یا نہیں اس کی رپورٹ شائع ہوئی اور فرائڈمین کی مشہور کتاب دی لیگل تھیوری میں اس رپورٹ کا خلاصہ دیا گیا اس رپورٹ لکھنے والوں نے کافی بحث کرنے کے بعد یہ کہا کہ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ چیز کوئی اچھی نہیں لگتی۔ لیکن چونکہ ہم ایک مرتبہ یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ انسان کی پرائیویٹ زندگی میں قانون کو دخل انداز نہیں ہونا چاہئے اس واسطے اس اصول کی روشنی میں جب تک ہم سن اور کرائم میں تفریق برقرار رکھیں گے کہ سن اور چیز ہے، کرائم اور چیز ہے اس وقت تک ہمارے پاس اس عمل کو روکنے کی دلیل نہیں ہے، ہاں اگر سن اور کرائم کو ایک تصور کر لیا جائے تو پھر بے شک اس بل کے خلاف رائے دی جا سکتی ہے اس لئے ہمارے پاس اس بل کو رد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے، لہٰذا یہ بل پاس ہونا چاہئے'' جب ہم یہ کہتے ہیں اس کو اسلامائز کیا جائے تو اسکے معنی یہی ہیں کہ سیکولر نظام نے جو بنیادیں عقل اور مشاہدہ کی اختیار کی ہوئی ہیں اس کے آگے ایک اور قدم بڑھا کر وحی الٰہی کو بھی علم کے حصول اور رہنمائی کا ذریعہ قرار دے کر اس کو نیا شعار بنائیں۔

وحی کی ضرورت

اگر یہ بات ذہن میں آجائے کہ وحی شروع ہی وہاں سے ہوتی ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے تو پھر وحی کے ذریعے قرآن یا سنت میں جب کوئی حکم آجائے تو اس کو اس بنا پر رد کرنا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا احمقانہ بات ہوگی اس واسطے کہ وہ حکم آیا ہی اس جگہ ہے جہاں عقلی توجیہ (ریزن) کام نہیں دے رہی اگر عقلی توجیہ کام دے چکی ہوتی تو اس کے آنے کی ضرورت ہی نہیں اس حکم کے پیچھے جو حکمتیں ہیں اگر وہ ساری حکمتیں عقل ادراک کرسکتی تو پھر اللہ کو وحی کے ذریعے اس کے حکم دینے کی چنداں حاجت نہیں تھی۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہیں سے ایک اور سوال کا جواب بھی مل گیا جو اکثر ہمارے پڑھے لکھے حضرات کے دلوں میں ہوا کرتا ہے کہ صاحب! آج سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے ساری دنیا اس میں ترقی کر رہی ہے مگر ہمارا قرآن اور ہماری حدیث سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں ہمیں کوئی فارمولا نہیں بتاتا، کہ کس طرح ایٹم بم بنائیں کس طرح ہائیڈروجن بم بنائیں کس طرح ٹینک بنائیں اس کا کوئی فارمولا نہ تو قرآن کریم میں ملتا ہے نہ حدیث پاک میں ملتا ہے اس کی وجہ سے ایسے لوگ احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں کہ دنیا چاند پر پہنچ رہی ہے اور ہمارا قرآن ہمیں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ چاند پر کیسے پہنچیں۔

قرآن و حدیث ہمیں اس لئے یہ نہیں بتاتا کہ وہ دائرہ عقل کا ہے وہ تجربہ، ذاتی محنت اور کوشش کا دائرہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو انسان کے عقل مشاہدے اور ذاتی کوشش پر چھوڑا ہے جو شخص جتنی کوشش کرے گا عقل مشاہدے اور تجربے کو استعمال کرے گا اس میں اتنا ہی آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ قرآن مجید آیا ہی اس جگہ پر ہے جہاں عقل کا دائرہ ختم ہو رہا تھا عقل پوری طرح اس کا ادراک نہیں کرسکتی تھی، ان چیزوں کا ہمیں قرآن و حدیث نے سبق پڑھایا ہے اور معلومات فراہم کی ہیں۔ اسلامائزیشن آف لاز کا سارا فلسفہ یہی ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی کو اس کے تابع بنائیں۔

چودہ سو سال پرانے اصولوں کو آج کیسے منطبق کریں

آخر میں ایک اور بات عرض کر دوں کہ جب یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے تو بعض اوقات دل میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ چودہ سو سال پرانی زندگی کو کیسے لوٹائیں چودہ سو سال پرانے اصولوں کو آج بیسویں اکیسویں صدی پر کیسے اپلائی (منطبق) کریں جب کہ ہماری ضروریات نوع بنوع بدلتی ہیں۔ دراصل یہ اشکال اسلامی علوم کی ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اس لئے کہ اسلام نے اپنے احکام کے حصے رکھے ہیں ایک حصہ وہ ہے جس میں قرآن یا سنت کی نص قطعی موجود ہے جس میں آنے والے تمام حالات کی وجہ سے قیام قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی یہ غیر متبدل اصول ہیں زمانہ کیسا ہی ہو جائے اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی دوسرا حصہ وہ ہے جس کے اندر اجتہاد اور استنباط کی گنجائش رکھی گئی ہے اور اس میں

قطعی نصوص اس درجے کی نہیں ہیں جو ہر زمانے کے ہر حال پر اپلائی کریں، اس میں خود لچک موجود ہے اور تیسرا حصہ وہ ہے جس کے بارے میں قرآن و سنت خاموش ہے یعنی کوئی ہدایت ان کے بارے میں نہیں کی گئی قرآن و سنت نے جن کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا وہ اس لئے نہیں دیا کہ اس کو ہماری عقل پر چھوڑا ہے۔

عقل کو اس کے دائرہ سے باہر استعمال کرنے کا نقصان

اس لئے بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ قرآن مجید نے خنزیر کو اس لئے حرام کیا تھا کہ اس زمانہ میں خنزیر بڑے گندے اور غیر پسندیدہ قسم کے ماحول میں پرورش پاتے تھے اور غلاظتیں کھاتے تھے اب تو خنزیر کے لئے بڑے ہائی جینک فارم تیار کر دیئے گئے ہیں اور بڑے صحت مندانہ طریقے سے پرورش ہوتی ہے لہٰذا اب یہ حکم ختم ہے۔ یہ حقیقت میں عقل کو ایسی جگہ استعمال کرنا ہے جہاں وہ کام دینے سے انکار کر رہی ہے۔

حلال و حرام کا تعین وحی الٰہی سے ہی ہو سکتا ہے

اسی طرح قرآن نے جب سود کو حرام کر دیا تو عقل میں چاہے آئے یا نہ آئے دیکھئے قرآن پاک میں مشرکین عرب کے بارے میں کہا گیا کہ وہ یہ کہتے ہیں انما البیع مثل الربوا (سورۃ بقرہ: ۲۷۵) کہ بیع بھی ربا جیسی ایک چیز ہے" تجارت بیع اور شراء سے بھی انسان نفع کماتا ہے اور ربا سے بھی نفع کماتا ہے لیکن

قرآن نے دونوں میں فرق بیان نہیں کیا بلکہ صاف یہ کہہ دیا واحل اللہ البیع و حرم الربوا (سورۃ بقرہ) اللہ نے بیع کو حلال کیا اور ربا کو حرام کیا ہے۔ اب آگے اس میں تمہارے لئے چون و چرا کی مجال نہیں، اب اللہ نے حلال کر دیا ہے تو حلال، حرام کر دیا ہے تو حرام۔ اب اس کے اندر باتیں نکالنا درحقیقت عقل کو غلط جگہ استعمال کرنا ہے۔

آج کل کے اجتہاد کا واقعہ

ایک مثل مشہور ہے کہ ایک ہندوستانی گویا حج کرنے چلا گیا حج کرنے کے بعد مدینہ شریف جا رہا تھا، اس زمانے میں راستے میں منزلیں ہوتی تھیں جہاں رات گزارنی پڑتی تھی جب ایک منزل پر ٹھہرا وہاں پر ایک عرب گویا آ گیا وہ بدو قسم کا عرب گویا تھا اس نے بے ڈھنگے انداز سے سارنگی بجانا شروع کیا آواز بھی بڑی بھدی تھی اور اس کو سارنگی اور طبلہ بھی صحیح بجانا نہیں آتا تھا ہندوستانی گویئے نے اس کی آواز سن کر کہا کہ آج میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ آنحضرت ﷺ نے گانے بجانے کو کیوں حرام کیا؟ دراصل آپ ﷺ نے بدوؤں کا گانا سنا تھا اگر میرا گانا سن لیتے تو حرام نہ کرتے۔ تو اس قسم کی سوچ پیدا ہو رہی ہے جس کو اجتہاد کا نام دیا جا رہا ہے یہ نصوص قطعیہ کے اندر اپنی خواہشات نفس کے مطابق عقل کو استعمال کرنا ہے۔

آج کا مفکر اور مجتہد

بات یہاں تک پہنچی کہ ہمارے ہاں ایک معروف مفکر ہیں، مفکر اس لیے

کہوں گا کہ وہ اپنی فیلڈ میں مفکر ہی سمجھے جاتے ہیں قرآن شریف کی یہ جو آیت السارق و السارقة فاقطعوا ایدیھما (المائدہ آیت: ۳۸) ''چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹ دو'' تو انہوں نے اس کی تفسیر یہ کی کہ چور سے مراد سرمایہ دار ہیں جنہوں نے بڑی بڑی صنعتیں قائم کر رکھی ہیں اور ہاتھ سے مراد ان کی انڈسٹریاں ہیں اور کاٹنے سے مراد ان کا نیشنلائزیشن ہے لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ سارے سرمایہ داروں کی ساری انڈسٹریوں کو نیشنلائز کر لیا جائے اور اس طریقے سے چوری کا یہ دروازہ بند ہو جائے گا۔

اس قسم کے اجتہادات کے بارے میں اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ

زاجتہادے عالمان کم نظر
اقتداء بارفتگاں محفوظ تر

یعنی ایسے کم نظر لوگوں کے اجتہاد سے پرانے لوگوں کی باتوں کی اقتداء کرنا زیادہ محفوظ ہے۔ مزید فرمایا:

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازہ تجدید
مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

میں آج کی اس نشست سے یہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اپنے استحقاق اور وعدے سے بھی زیادہ آپ حضرات کا وقت لیا ہے لیکن بات یہ ہے کہ جب تک اسلامائزیشن آف لاز کا فلسفہ ذہن میں نہ ہو تو محض اسلامائزیشن آف لاز کے لفظ کو درست کر لینے سے بات نہیں بنتی

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس لئے اسلامائزیشن کا پہلا سبق یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا یقین ہو ڈنکے کی چوٹ پر سینہ تان کر کسی معذرت خواہی کے بغیر کسی سے مرعوب ہوئے بغیر یہ بات کہہ سکیں کہ ہمارے نزدیک انسانیت کی فلاح کا اگر کوئی راستہ ہے تو وہ اسلامائزیشن میں ہے اس کے سوا کسی اور میں نہیں ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

ختمِ بخاری شریف

﴿ختم بخاری شریف﴾

بعد از خطبہ:

بزرگان محترم اور برادران عزیز!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

ایک حادثہ

اس جامعہ کے نہایت شفیق استاذ حضرت شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم کے صاحبزادے اور علم و عمل کے آسمان حضرت مولانا محمد مجاہد صاحب کے ساتھ سال کے دوران ایک حادثہ پیش آیا تھا وہ یہ کہ جمعہ کے دن وہ ظالموں کے ہاتھوں شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے (اللہ تعالیٰ ان کو درجات عالیہ سے نوازے) آمین۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی مشیت ہے کہ جس کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نوجوانی میں ان کو شہادت کے اس بلند مقام پر فائز فرمایا ہے جس کی تمنا بڑے بڑے اولیاء کرام اور بزرگان دین نے کی، دوسری طرف اللہ

تعالیٰ نے حضرت شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم کو صبر اور حوصلہ کا اعلیٰ مقام عطاء فرمایا اس لیے ہمارا حق بنتا ہے کہ ہم اس مجلس میں ان کے رفع درجات اور ان کے پسماندگان کے لئے صبر جمیل اور اجر جزیل کی دعا کریں۔

حدیث کی روایت کی حفاظت

ختم بخاری شریف کے اس مبارک موقعہ پر جو آخری حدیث تلاوت کی گئی اس کے بارے میں کچھ گذارشات عرض کرنا چاہتا ہوں۔

حدیث کے سلسلے کا ایک غیر معمولی مظاہرہ یہ ہے کہ امت محمدیہ علی صاحبہا التحیۃ والسلام نے نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو یاد رکھا بلکہ احادیث کی حفاظت کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ کی ایک ایک ادا کو محفوظ رکھنے اور تا قیامت آنے والے لوگوں تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ حضور اقدس ﷺ سے جیسے سنا، اسی کیفیت سے اپنے شاگردوں کو بتایا۔ اگر جناب رسول اللہ ﷺ نے کوئی بڑی حدیث ارشاد فرماتے وقت تبسم فرمایا تھا تو سننے والے جب اس حدیث کو بیان فرماتے تو تبسّم فرما کر دکھاتے، اگر آنحضرت ﷺ نے کسی صحابیؓ کو ارشاد فرماتے وقت اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا تو ان صحابیؓ نے وہ حدیث اپنے شاگرد کو سناتے وقت بالکل اسی طریقے سے ہاتھ میں ہاتھ لے کر سنائی اور پھر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔

حدیث مسلسل بالاولیہ

طلباء حدیث ایسی بے شمار احادیث جانتے ہیں جن کو ''حدیث مسلسل'' کہا جاتا ہے اور وہ اسی تسلسل کے ساتھ چلتی رہیں۔ انہیں میں سے ایک حدیث

''مسلسل بالاولیہ'' کہلاتی ہے، یعنی وہ حدیث ایسی ہے کہ جب بھی کوئی طالب علم، کسی استاذ سے حدیث پڑھنے جاتا تو استاذ جس حدیث کو سب سے پہلے پڑھاتا ہے وہ حدیث ''مسلسل بالاولیہ'' کہلاتی ہے اور یہ سلسلہ حضرت سفیان بن عیینہؒ سے لے کر آج تک چلا آ رہا ہے۔

تو گذشتہ سال کے اور اس سال کے فارغ التحصیل طلباء نے فرمائش کی ہے کہ آخری حدیث سے پہلے حدیث مسلسل بالاولیہ پڑھاؤں تاکہ سب سے پہلی حدیث جو میں آپ کو سناؤں اس کا سلسلہ حضرت سفیان بن عیینہؒ سے ملتا ہو۔ میں نے یہ حدیث تین اساتذہ کرام سے سنی ہے۔ ان میں پہلے حضرت شیخ حسن صاحبؒ ہیں جو کہ مالکی ہیں اور مکہ مکرمہ کی مسجد حرام میں درس حدیث دیا کرتے تھے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے سب سے پہلے مجھے یہ حدیث سنائی (جو آگے آ رہی ہے) اور دوسرے حضرت شیخ عبدالفتاح صاحبؒ ہیں علم حدیث کا ہر طالب علم ان کو جانتا ہے اور حال ہی میں ان کا انتقال ہوا ہے، ان سے بھی میں نے پہلے یہی حدیث سنی ہے۔ اور تیسرے حضرت شیخ محمد یاسین صاحبؒ ہیں جو کہ مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے، ان سے بھی میں نے پہلے یہی حدیث سنی ہے جو کہ یہ ہے:

﴿عن عبدالله بن عمرو بن العاص رضی الله عنهما قال! قال رسول اللّٰه ﷺ الراحمون یرحمهُم الرحمن تبارك و تعالیٰ ارحمو امن فی الارض یرحَمُکُم مَنْ فی السّمآء﴾

''نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ دوسروں پر رحم

کرتے ہیں، رحمٰن ان پر رحم کرتا ہے تم زمین والوں پر رحم کرو،
آسمان والا تم پر رحم کرے گا''۔

(رواہ ابوداؤد و الترمذی عن عبداللہ بن عمرو)

اس حدیث سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حدیث کے طالب علم کو سب سے پہلا درس دینے کے لئے محدثین کرام نے ایسی حدیث کا انتخاب فرمایا ہے جو سرا سر رحم پر مبنی ہے۔ میں اس حدیث کی اجازت اپنے تمام طالب علموں کو پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس کی برکات ہم سب کو عطا فرمائیں۔ آمین

صحیح بخاری کا ایک عجیب طرز

صحیح بخاری کا یہ آخری باب اور آخری حدیث ہے، امام بخاریؒ کے مطالب بھی عجیب وغریب ہیں کہ انہوں نے صحیح احادیث تو اپنی کتاب میں جمع فرمائی ہی ہیں لیکن تراجم الابواب کا حسن بھی خوب ہے یعنی باب کے عنوان اس طرح قائم کئے ہیں کہ ہر باب کا عنوان ایک مستقل فقہی یا کلامی مسئلہ یا ایک پیغام ہے جو امام بخاریؒ امت مسلمہ کو دینا چاہتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے اپنی اس کتاب میں جو آخری کتاب قائم فرمائی ہے وہ ''کتاب التوحید'' ہے۔ اور دیکھنے کی بات یہ ہے کہ توحید تو ایمان کا سب سے پہلا اور جزء اعظم ہے، اور کتاب الایمان میں توحید کا ذکر بار بار آ چکا، پھر آخر میں کتاب التوحید کو دوبارہ قائم کرنے کا بظاہر کوئی مقصد نظر نہیں آتا، لیکن اس سے امام بخاریؒ یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ایک مسلمان کی زندگی کا آغاز بھی کلمہ توحید سے ہوتا ہے اور اس کی زندگی کا اختتام بھی کلمہ توحید سے ہونا چاہئے۔

آغاز اور اختتام کلمۂ توحید پر

کلمۂ توحید سے زندگی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں سب سے پہلے جو کلمات ڈالے جاتے ہیں وہ ہیں۔ "اشهد ان لا اله الا الله و اشهدان محمّدا رسول الله" اور اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے جو سراسر کلمۂ توحید ہے، یہ ایمان کا پہلا بیج ہے جو اس کے کان کے ذریعے اس کے قلب میں اتارا گیا۔ پھر سارا معرکۂ زندگی سر کرنے کے بعد، سرد و گرم چکھنے کے بعد اور دنیا کے تمام جھمیلوں سے گذرنے کے بعد مسلمان کی زندگی کا اختتام بھی اس طریقے سے ہوتا ہے کہ مرنے والے کے آس پاس بیٹھنے والے لوگوں کو حکم ہے کہ وہ اس کو کلمۂ توحید کی تلقین کریں۔ تلقین کا معنی یہ نہیں ہے کہ کسی سے کہا جائے کہ تم کلمہ پڑھو بلکہ تلقین کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کو اس کی زندگی کے آخری لمحات میں دیکھو اور سمجھ لو کہ اب یہ دنیا سے رخصت ہونے والا ہے تو تم خود کلمۂ پڑھنا شروع کر دو تا کہ اس کو یاد آ جائے اور وہ آخری بات جو زبان سے نکالے وہ کلمۂ توحید ہو۔

اور حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کا آخری کلمہ "لا الہ الا اللہ" زبان سے نکلے تو وہ جنت میں جائے گا۔

حدیث کے بغیر قرآن کا سمجھنا ناممکن ہے

امام بخاریؒ کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہر باب میں کوئی نہ کوئی قرآنی آیت لاتے ہیں اور اس کے بعد حدیث ذکر کرتے ہیں جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نبی اکرم سرور دو عالم ﷺ کی حدیث خواہ قولی ہو یا فعلی، اللہ تعالیٰ کے کلام کی

تفصیل ہے لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ کے کلام کو سمجھنا ہے تو وہ حضور اکرم ﷺ کی حدیث کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ جو آدمی یہ چاہے، یا دعویٰ کرے کہ میں حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کو سمجھ لوں گا تو وہ درحقیقت نزول وحی اور اس دنیا میں پیغمبروں کی بعثت کے فلسفہ ہی سے جاہل ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب بھی اپنا کلام بھیجا تو ساتھ میں کسی پیغمبر کو بھی بھیجا اس لیے کہ اس کلام کو تم خود نہیں سمجھ سکتے۔ اسی لیے قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ

﴿لتبین للناس مانزل الیھم﴾

(پ۱۴ سورہ النحل آیت نمبر ۴۴)

جن پر ہم نے قرآن اتارا، ان کو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ لوگوں کو اس کی تفسیر کر کے بتائیں، چنانچہ تم ان کی تعلیمات کی روشنی میں قرآن کو پڑھو اور اگر تم نے حدیث سے قطع نظر کر کے سرکار دو عالم ﷺ کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا اور ڈکشنری کی مدد سے قرآن سمجھنے کی کوشش کی تو قرآن تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔

پیغمبر کو بھیجنے کی ایک ظاہری حکمت

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کسی نے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کے اخلاق کیسے تھے؟ تو حضرت عائشہؓ فرمایا

﴿کان خلقه القرآن﴾

''آپ کا اخلاق قرآن تھا (یعنی آپ ﷺ قرآن کی عملی تفسیر تھے)''

(تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۱۸۶)

تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ وہ احکام الٰہی کی تفسیر کریں۔

مشرکین مکہ کہتے تھے کہ یہ قرآن جو اللہ کی طرف سے جناب رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتا ہے، اگر اللہ نے ہمیں ہدایت دینی تھی تو براہ راست کیوں نہ ہدایت دے دی؟

دراصل پیغمبر کو اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ اگر صرف کتاب ہر آدمی پر نازل کر دی جاتی تو وہ اپنی سمجھ سے اس کو نجانے کیا سمجھتا؟ اور کس طرح اس پر عمل کرتا؟ دراصل پیغمبر کا کام ہوتا ہے۔

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

''کہ وہ کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں''

(سورۂ بقرہ: ۱۲۹)

لیکن لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اگر اللہ کی کتاب کافی ہوتی تو کسی پیغمبر کو بھیجنے کی ضرورت نہ تھی۔

قرآن کے ساتھ حضور ﷺ کے مبعوث ہونے کی وجہ

اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَ كِتَابٌ مُبِيْنٌ﴾

''ہم نے تمہارے پاس ایک ایسی کتاب بھیجی ہے کہ جو مبہم نہیں اور نہ ہی مجمل ہے بلکہ کتاب مبین (واضح کتاب) بھیجی ہے''۔ (پ ٦ سورہ المائدہ آیت نمبر ۱۵)

اس پر اعتراض ہوسکتا تھا کہ جب واضح کتاب بھیج دی تو اس پر تشریح کی کیا ضرورت تھی؟ یاد رکھیں! اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے خود سمجھایا کہ اگر تمہارے پاس کوئی عالیشان کتاب ہو لیکن اندھیرا ہو، نہ سورج کی روشنی ہو اور نہ دن کی

روشنی، نہ چراغ کی روشنی ہو اور نہ بجلی کی روشنی، تو کیا وہ کتاب تمہارے کام آئے گی؟ کیونکہ روشنی کے بغیر فائدہ تو دور کی بات تم اس کو پڑھ ہی نہیں سکتے اور پھر ان چیزوں کے موجود ہونے کے بعد خدانخواستہ تمہارے پاس آنکھ ہی نہیں تو وہ کتاب تمہارے لئے کارآمد نہیں ہوسکتی تھی اسی لیے ہم نے اس کتاب مبین کے ساتھ ایک نور بھیج دیا اور وہ نور ہے جناب رسول اللہ ﷺ کی تفسیر وتشریح اور تعلیم۔

مقصد بعثت رسول ﷺ :

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے مقصد کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَيُزَكِّيهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

''آپ ﷺ کو اس لیے بھیجا تاکہ آپ ان کو پاک صاف کریں اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیں''۔

قرآن حکیم میں کہیں "یعلمهم" پہلے ہے اور کہیں "یزکیهم" اس کی وجہ مفسرین کرام نے یہ لکھی ہے کہ جہاں "یزکیهم" پہلے ہے وہاں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس کتاب کو سمجھنے سے پہلے انسان کا دل پاک صاف ہونا چاہئے اور اگر دل میں طلب اور اسلام نہیں تو وہ حضور اقدس ﷺ کی تعلیمات سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

اعمال کا وزن کیا جائے گا؟

یہاں پر امام بخاریؒ نے یہ آیت ذکر فرمائی:

﴿و نضع الموازين القسط ليوم القيٰمة﴾

”کہ ہم قیامت کے دن لوگوں کے درمیان عدل و انصاف
کے فیصلے کیلئے ترازویں لگائیں گے اور ان ترازوں میں انسان
کے اعمال کو تولا جائے گا“۔(سورۂ انبیاء :۴۷ پ ۱۷)

اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ترازووں میں کوئی اجناس مثل گندم اور چاول نہیں تولی جائیں گی اور نہ ہی انسانوں کو تولا جائے گا بلکہ بقول امام بخاریؒ بنی آدم کے اعمال و اقوال کو تولا جائے گا۔ اشارہ اس بات کی طرف مقصود ہے کہ جب انسان دنیا میں آتا ہے تو اس پر کچھ اعمال فرض، واجب، سنت اور مستحب کے درجے میں لاگو کر دیئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ نے سب سے پہلے کتاب الایمان قائم کی، اس کے بعد کتاب العلم، اس کے بعد کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوۃ، کتاب الزکوۃ، کتاب الصوم اور کتاب الحج، نکاح، طلاق اور بیع کے بارے میں ابواب قائم کئے، پھر معاملات، معاشرت اور اخلاقیات وغیرہ جتنے احوال بھی انسان کی زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں ان تمام اعمال کے بارے میں ابواب قائم کرنے کے بعد آخر میں کہتے کہ "ان اعمال بنی آدم و قوله یوزن" تاکہ یاد دہانی کرا دیں کہ اعمال اور اقوال کا وزن ہوگا۔ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ اعمال میں وزن کس طرح پیدا ہو؟ اس لیے ہر عمل کرتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ اللہ جل شانہ کے سامنے حاضری کے وقت اس عمل کو تولا جائے گا۔ مثلاً نماز تو پڑھ لی لیکن اس میں دکھاوا شامل ہوگیا تو عمل ہونے کے باوجود اس میں وزن نہ رہا۔

اعمال کے اندر وزن پیدا کرنے کا طریقہ

یاد رکھیں! اعمال کے اندر وزن دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک صدق

سے اور دوسرا اخلاص سے۔ صدق کا معنی یہ ہے کہ عمل سنت اور شریعت کے مطابق کرے اس کے برخلاف کی صورت میں اعمال کے اندر وزن پیدا نہیں ہو سکتا اور اخلاص کا معنی یہ ہے کہ اس میں مخلوق کی رضا شامل نہ ہو بلکہ خالق کو راضی کرنا مقصود ہو، لہٰذا جو بھی عمل رسول اللہ ﷺ کی سنت کے خلاف ہو اسے سنت سمجھ کر کیا جائے تو وہ بدعت بن جاتا ہے۔ اور بدعات بظاہر تو بڑی اچھی نظر آتی ہیں مثلاً ایک آدمی کے مرنے کے بعد اس کا تیجہ، دسواں یا چہلم کر دیا جائے تو بظاہر اس میں کیا حرج ہے؟ قرآن ہی تو پڑھا گیا، دعوت ہی تو کی گئی اور غریبوں کے ساتھ ساتھ امیروں کو بھی کھلا دیا تو کیا فرق پڑ گیا؟ تو سن لیجئے کہ حرج یہ ہے کہ یہ عمل رسول اللہ ﷺ کی سنت کے خلاف ہے اور جو کام سنت کے مطابق نہ ہو تو اس میں وزن نہیں ہوتا اور جس عمل میں وزن نہ ہو وہ اللہ کے یہاں مقبول نہیں۔

بدعت کی ایک آسان مثال

میں اس کی مثال یوں دیا کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص کہے کہ مغرب کی نماز میں تین کی بجائے چار رکعتیں ہونی چاہئیں، لہٰذا وہ تین کو نامکمل سمجھتے ہوئے چار رکعتیں پڑھ لیتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اس کی چوتھی رکعت بیکار ہو گی بلکہ بعض صورتوں میں وہ تین بھی ضائع ہو جائیں گی، کیونکہ ایسا کرنا اللہ کے حکم اور جناب رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔ بہت سے کفار و مشرکین کے دل میں اخلاص ہوتا ہے اور ان کا مقصد بھی خدا کو راضی کرنا ہوتا ہے، گنگا کے کنارے جا کر دیکھئے کہ کتنے ہی آدمی ایک ٹانگ پر کھڑے ہیں اور کتنے ہی مہینوں تک کھانا نہیں کھاتے اور طرح طرح کے مجاہدات میں لگے رہتے ہیں۔ تو بظاہر ان کا مقصد بھی خدا کو راضی کرنا ہوتا ہے لیکن چونکہ طریقہ صحیح نہیں اس لئے ان کے ان

مجاہدات کا کوئی فائدہ نہیں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا﴾

''کیا میں بتاؤں کہ اس دنیا میں سب سے زیادہ نقصان میں کون لوگ ہیں؟ جن کی محنت اس دنیا میں رائیگاں گئی اور وہ سمجھتے رہے کہ ہم نے اچھا کام کیا''۔

(پ ۱۶ سورۃ الکہف آیت نمبر ۱۰۳،۱۰۴)

تو اگر صدق یا طریق سنت سے محروم ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہیں قرآن پاک فرماتا ہے۔

﴿وَقَدِمْنَا اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾

''جو عمل انہوں نے کیے، ایمان اور علاوہ اس طریقے کے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بتایا تو وہ سارے اعمال ہم قیامت کے دن ایسے کر دیں گے جیسے اڑتا ہوا غبار''۔

(پ ۱۹ سورۃ الفرقان آیت نمبر ۲۳)

ہدیہ دیتے وقت بھی اچھی نیت کر لیں

بزرگوں نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ یہ جو تم ایک دوسرے کو ہدیہ دیتے ہو، جس کی ترغیب بھی رسول اللہ ﷺ نے دی کہ ایک دوسرے کو ہدیہ دو، اس سے

آپس میں محبت بڑھتی ہے۔ تو اس وقت بھی دل میں مقصد اللہ کو راضی کرنا ہو اور دل میں سنت نبوی ﷺ کی نیت کرے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی طرف سے کسی جواب کا انتظار نہیں ہوگا اور اس میں وزن پیدا ہوگا۔ لیکن اگر دینے کا مقصد لینا یا لوگوں کے سامنے تعریف کرانا ہو تو اس میں اخلاص نہ رہا جس کی وجہ سے اس میں وزن نہ رہا۔

اخلاص عظیم دولت ہے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں کہ یہ جو اعزہ و اقرباء میں لڑائیاں اور جھگڑے ہوتے ہیں اس کا ایک بنیادی سبب یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے اعزہ سے توقعات وابستہ کئے ہوتا ہے اور اگر کوئی اپنی توقعات کو صرف اللہ کے ساتھ وابستہ کر لے تو انشاء اللہ وہ باعث اجر ہوگا اور اسے کوئی رنجش، شکوہ، اور کوئی گلہ نہیں ہوگا اس لیے اخلاص بڑی عظیم دولت ہے۔

تو امام بخاریؒ اپنی آخری کتاب میں بیان فرما رہے ہیں کہ یہ جتنی عبادات میں پیچھے بیان کر چکا ہوں ان تمام اعمال کو انجام دیتے وقت نیت درست کر لو کہ میں یہ عمل اللہ جل شانہ کی رضا جوئی کے لیے کر رہا ہوں تاکہ مباح کام (وہ کام کہ جن پر بظاہر نہ ثواب ہو اور نہ گناہ) بھی درست نیت سے باعث اجر و ثواب بن جائیں۔

لوگوں کی عام حالت

یہاں یہ بات بھی واضح کرتا چلوں آج کل کہ لوگ بہت کثرت سے اس

غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ حدیث میں ہے "انما الاعمال بالنیات" کہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ (صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۲) اور اس حدیث کی آڑ میں یہ سوچ کر ہر طرح کے ناجائز کام کر رہے ہیں کہ ہماری نیت تو صحیح ہے۔ مثلاً سود کا معاملہ میں لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس کے ذریعے اپنے اہل و عیال کے لیے کھانے، پینے کا انتظام کریں گے اسی لیے یہ جائز ہوا۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اس حدیث میں وہ اعمال مراد ہیں جو کہ جائز ہوں۔ ناجائز اور حرام کام خواہ کتنی ہی اچھی نیت سے ہوں وہ کبھی جائز اور حلال نہیں ہو سکتے۔ کوئی آدمی غریبوں میں مال تقسیم کرنے کی نیت سے چوری کرتا ہے تو یہ اچھی نیت چوری کے حلال ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

غرضیکہ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے پتہ چلا کہ قیامت کے دن ترازو دیں قائم کی جائیں گی جس میں اعمال تولے جائیں گے۔ پھر آگے "وقولہ" فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اعمال کے ساتھ ساتھ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ بھی تولے جائیں گے۔

ایک حدیث میں حضور اکرم ﷺ کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ انسان کو جہنم میں اوندھے منہ گرانے والی چیز انسان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں (رواہ احمد والترمذی بحوالہ مشکوۃ جلد ۱ صفحہ ۱۴) اور لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ زبان سے الفاظ نکالتے ہوئے سوچتے ہی نہیں اور مفت کا عذاب سر لیتے ہیں۔

بخاری کی آخری حدیث

آخر میں بخاری شریف کی آخری حدیث اس طرح ہے:

﴿عن ابی هریرۃؓ قال! قال رسول اللہ ﷺ کلمتان حبیبتان الی الرحمٰن خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم﴾ (صحیح بخاری جلد۲ صفحہ ۱۱۲۹)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا دو کلمے ایسے ہیں جو رحمان کو محبوب ہیں۔ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ننانوے ۹۹ اسمائے حسنٰی میں صرف رحمٰن کو اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے خاص کیا ہے کہ جب یہ رحمٰن کو محبوب ہیں تو جو شخص یہ کلمے پڑھے گا، اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں گی۔ آگے فرمایا کہ "خفیفتان علی اللسان" "زبان کے اوپر بہت ہلکے ہیں" دل میں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب زبان پر ہلکے ہیں تو میزان میں بھی ہلکے ہوں گے تو آگے فرما دیا "ثقیلتان فی المیزان" کہ میزان عمل میں ان کا وزن بہت ہے۔ اس حدیث میں ان دو کلمات کے تین وصف بیان فرمائے گئے ہیں کہ رحمٰن کو محبوب، زبان پر ہلکے اور میزان میں بھاری ہیں۔ وہ دو کلمے یہ ہیں "سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم" یہ جو قرآن اور حدیث میں اعمال کی فضیلت بیان کی جاتی ہے اس کا فائدہ بظاہر نظر نہیں آتا لیکن ان سب کی فضیلت اور نور قیامت کے دن ظاہر ہوگا اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مادہ پرستی سے مبرا رکھا ہے وہ ان کلمات کی تاثیر کو خوب سمجھ سکتے ہیں۔

ایک کلمۂ حمد کی تاثیر

حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے "ربنا لك الحمد" کے ساتھ "الحمد لله حمدا كثيرا طيبًا مبارکا فيه" کہہ دیا تو حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ یہ کس نے پڑھا تھا؟ ان صحابیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے پڑھا تھا! جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے ایسا کلمہ پڑھا ہے کہ ستر سے زیادہ فرشتے اس کلمے کو پکڑنے کے لیے دوڑے تاکہ میں سب سے پہلے اس کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کروں۔ (رواہ البخاری بحوالہ مشکوٰۃ جلد ۱ صفحہ ۸۲) تو ان اعمال کی قدر ترازو دیں قائم ہونے کے وقت آئے گی۔

اس کلمہ سے خشیت باری پیدا ہو جاتی ہے

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص "سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم" ۱۰۰ (سو) مرتبہ صبح اور ۱۰۰ (سو) مرتبہ شام کو پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔ (صحیح مسلم باب فضل التھلیل والتسبیح والدعا جلد ۴ صفحہ ۲۰۷۱) اس کلمے کی خاصیت بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ ایک بزرگ نے فرمایا کہ پہلا کلمہ (سبحان الله وبحمده) اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے اور دوسرا کلمہ (سبحان اللہ العظیم) سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اقرار ہے۔ تو پہلا کلمہ صفت کمال کو اور دوسرا کلمہ صفت جلال کو واضح کرتا ہے۔ تو جس ذات کے اندر جمال و کمال کی صفت پائی جائے اس ذات کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے اور جس ذات کے اندر جلال ہو تو اس کا خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب محبت اور خوف پیدا ہو جائے گا تو خشیت

آجائے گی اور انسان کی زندگی کو سنوارنے کے لیے یہ چیزیں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو یہ کلمہ سمجھ کر پڑھنے اور اس کی نورانیت سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين۔

بدعت ایک گمراہی

موضوع = بدعت ایک گمراہی
بیان = شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ
ضبط و ترتیب = مولانا خالد محمود (فاضل جامعہ اشرفیہ، لاہور)
باہتمام = محمد ناظم اشرف
ناشر = بیت العلوم۔ ۲۰ نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی، لاہور
فون: ۷۳۵۲۴۸۳

﴿بدعت ایک گمراہی﴾

بعد از خطبہ:

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ

﴿فان خیر الحدیث کتاب اللّٰہ وخیر الهدی هدی محمد ﷺ﴾ (صحیح مسلم کتاب الجمعۃ باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ عن جابرؓ جلد۲ صفحہ۵۹۲)

اس روئے زمین پر بہترین کلام اور سب سے اچھا کلام اللہ کی کتاب ہے، اس سے بڑھ کر اس سے اعلیٰ اس سے افضل اور بہتر کلام کوئی نہیں۔ اور زندگی گزارنے کے جتنے طرز ہیں۔ ان میں سب سے بہترین طرزِ زندگی محمد ﷺ کا طرزِ زندگی ہے۔

یہ بات حضور ﷺ اپنے بارے میں خود فرمارہے ہیں۔ آپ دیکھیں! کوئی بھی شخص اپنے بارے میں یہ نہیں کہتا کہ میرا طریقہ سب سے اعلیٰ ہے، مجھ سے زیادہ بہتر کوئی نہیں، چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو بھیجا ہی اس لئے کہ لوگوں کے لئے آپ نمونہ ہوں، اور اگر کوئی بہترین زندگی گزارنا چاہتا ہے تو آپ علیہ

الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ اختیار کرے، اس لئے دعوت وتبلیغ کی ضرورت کے تحت ارشاد فرمایا ہے کہ بہترطریقہ وہ ہے جو جناب محمدرسول اللہﷺ نے تمہارے واسطے چھوڑا ہے۔ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، دوسروں کے ساتھ معاملات کرنے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے میں جو طریقہ محمد رسولﷺ نے ارشادفرمایا اس سے بہتر کوئی اورطریقہ نہیں ہوسکتا۔

بدعت بدترین گمراہی

پھر آگے جن چیزوں سے گمراہی کے امکانات ہوسکتے تھے، آپﷺ نے ان کی جڑیں بتادیں اورفرمایا:

﴿شر الامور محدثاتها و كل بدعة ضلالة﴾ (حوالہ بالا)

اس روئے زمین پر بدترین کام وہ ہیں جو نئے نئے طریقے دین میں ایجاد کئے جائیں۔ حدیث میں بدترین کام کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس لئے کہ بدعت ایسی چیز ہے جو ظاہری گناہوں اور ظاہری فسق وفجور سے بھی بدترین ہیں۔ اس لئے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا وہ ان ظاہری گناہوں کو برا سمجھے گا، کوئی بھی مسلمان اگرکسی گناہ میں مبتلا ہے، شراب پیتا ہے، بدکاری کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، غیبت کرتا ہے، اس سے اگر پوچھا جائے کہ یہ کام تمہارے خیال میں کیسے ہیں؟ جواب میں یہی کہے گا یہ کام ہیں تو برے، لیکن کیا کروں میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ اور اگر وہ ان گناہوں کو برا سمجھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو کبھی نہ کبھی توبہ کی توفیق بھی عطا فرمادیں گے۔

لیکن بدعت یعنی جو چیز دین میں نئی ایجاد کی گئی ہے اس کی خاصیت یہ

ہے کہ جو شخص اس میں مبتلا ہوتا ہے وہ اس کو برا نہیں سمجھتا، وہ سمجھتا ہے کہ یہ بہت اچھا کام ہے۔ اور اگر دوسرا کوئی اس سے یہ کہے کہ یہ بری بات ہے تو اس سے بحث ومباحثہ اور مناظرہ کرنے کو تیار ہوجاتا ہے کہ اس میں کیا خرابی ہے۔ جب ایک شخص گناہ کو گناہ اور برائی کو برائی سمجھتا ہی نہیں تو وہ اس کی نتیجے میں گمراہی میں اور زیادہ پختہ ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا ''**شر الا مور** '' جس کے معنی ہیں کہ جتنے برے کام ہیں ان میں سب سے بدتر کام بدعت ہے، یعنی جو شخص دین میں نیا طریقہ ایجاد کرلے جو رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے طریقے سے مختلف ہو وہ بدعت ہے۔ پھر آگے اس کی وجہ بھی بتادی کہ'' **کل بدعةٍ ضلالة** ''یعنی ہر بدعت گمراہی ہے، لہٰذا جو شخص بدعت کے اندر مبتلا ہے وہ لازماً گمراہی کے اندر مبتلا ہے۔

بدترین گناہ بدعت کا گناہ ہے

یادرکھیں! ایک عملی کوتاہی ہوتی ہے اور ایک اعتقادی۔ عملی کوتاہی تو یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی گناہ کو گناہ سمجھتا ہے مگر بتقاضہ بشریت اس سے گناہ سرزد ہوجاتے ہیں۔

اور اعتقادی گمراہی یہ ہوتی ہے کوئی شخص کسی ناحق بات کو حق اور گناہ کو ثواب سمجھ رہا ہے، پہلی چیز یعنی عملی کوتاہی کا مداوا تو آسان ہے کہ کبھی نہ کبھی توبہ کرلے گا تو معاف ہوجائے گی۔ لیکن جو شخص گناہ کو ثواب سمجھ رہا ہو اس کی ہدایت بہت مشکل ہے۔ اسی لئے فرمایا بدترین گناہ بدعت کا گناہ ہے۔ اسی لئے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بدعت سے اتنا بھاگتے تھے کہ کوئی حد نہیں۔

بدعتی در پردہ دین کا موجد ہے

بدعت کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ آدمی خود دین کا موجد بن جاتا ہے۔ جبکہ دین کے موجد صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں۔ لیکن بدعت کرنے والا خود دین کا موجد بن جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ دین کا راستہ میں بنا رہا ہوں اور وہ درپردہ دعویٰ کرتا ہے کہ نعوذ باللہ جو میں کہوں وہ دین ہے، اللہ اور اللہ کے رسول نے جو راستہ بتایا اور جس پر صحابہ کرامؓ نے عمل کیا میں ان سے بڑھ کر دین دار ہوں اور میں دین کو ان سے زیادہ جانتا ہوں، تو یہ شریعت کی اتباع نہیں اپنی خواہشِ نفس کی اتباع ہے۔

خود ساختہ عمل مقبول نہیں

آپ نے سنا ہوگا کہ ہندو مذہب میں کتنے ہی لوگ گنگا کے کنارے اللہ کو راضی کرنے کے لئے ایسی ایسی ریاضتیں اور ایسی ایسی محنتیں کرتے ہیں جس کو دیکھ کر انسان حیران ہوجاتا ہے۔ کوئی آدمی اپنا ہاتھ بلند کرکے سالہا سال تک اسی طرح کھڑا ہے ہاتھ نیچے نہیں کرتا، کسی آدمی نے سانس کھینچا ہوا ہے اور گھنٹوں تک حبسِ دم کررہاہے، اگر اس سے پوچھا جائے کہ تو یہ کام کیوں کر رہاہے؟ تو وہ جواب دے گا کہ یہ میں اس لئے کررہا ہوں کہ میرا اللہ راضی ہوجائے، اب چاہے وہ اللہ کو بھگوان کا نام دے یا کچھ اور کہے لیکن اُس کے اس عمل کی کوئی قیمت نہیں؟ حالانکہ بظاہر اس کی نیت اپنے اللہ کو راضی کرنے کی وجہ سے درست معلوم ہوتی ہے لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس لئے کہ اللہ کو راضی

کرنے کا جو طریقہ اس نے اختیار کیا وہ اللہ اور اس کے رسول کا بتایا ہوا نہیں بلکہ وہ طریقہ اس نے اپنے دل ودماغ سے گھڑ لیا ہے، اس واسطے اللہ کے یہاں اس کا کوئی عمل قبول نہیں۔ایسے اعمال کے بارے میں قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے۔

﴿ وَقَدِ مْنَا اِلٰی مَا عَمِلُوامِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَا هُ هَبَاءً مَنْثُوْرًا ﴾

(سورۃ الفرقان آیت:۲۳پ۱۹)

ایسے لوگ جو عمل کرتے ہیں ہم ان کے عمل کو اس طرح اڑا دیتے ہیں، جیسے ہوا میں اڑائی ہوئی مٹی اور گردوغبار۔ انہوں نے عمل کیا اکارت گیا محنت بھی کی لیکن بیکار گئی۔ کتنے پیارے اور شفقت بھرے انداز سے قرآن کریم نے فرمایا:

﴿ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَ خْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴾ (سورۃ الکہف آیت ۱۰۳، ۱۰۴ پ۱۶)

قرآن مجید نبی کریم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ لوگوں سے کہیں کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اس دنیا میں سب سے زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں؟ فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا عمل اس دنیا میں اکارت ہوگیا۔ جنہوں نے بہت محنت کی ،تکلیفیں اٹھائیں اور وقت بھی خرچ کیا لیکن وہ سارا کا سارا کام اکارت ہوگیا اور وہ دل میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ بہت اچھا کام کررہے ہیں۔ اور وہ اس لئے خسارے میں ہیں کہ جو فاسق وفاجر یا کافر تھا اس نے کم ازکم دنیا میں تو عیش کرلی ، اس کی آخرت گئی سو گئی لیکن دنیا میں تو عیش کرگیا۔ اور یہ اپنی دنیا بھی خراب کررہا ہے ، محنت بھی اٹھارہا ہے اور آخرت بھی بگاڑ رہا ہے ، کیونکہ وہ طریقہ اختیار کئے ہوئے ہے جو اللہ کے رسول ﷺ نے اُسے نہیں بتایا۔ اس لئے بدعت

کے بارے میں فرمایا ''شر الامور'' سارے کاموں میں بدترین کام ہے کیونکہ آدمی محنت تو کرتا ہے لیکن اس کے نتیجے میں حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمارے دلوں میں یہ بات بٹھادے کہ دین اصل میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع کا نام ہے، اپنی طرف سے کوئی بات گھڑنے کا نام دین نہیں ہے۔

اتباع اور ابتداع

عربی زبان میں دو لفظ ہیں ایک اتباع اور دوسرا ابتداع۔ اتباع کے معنی ہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے حکم کی پیروی کرنا۔اور ابتداع کے معنی ہیں دین میں اپنی طرف سے کوئی چیز ایجاد کرکے اس کے پیچھے چل پڑنا۔ جب حضرت صدیق اکبرؓ خلیفہ بنے تو سب سے پہلے جو خطبہ دیا اس میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے کہ انی متبع ولست بمبتدع (طبقات ابن سعد جلد۳ صفحہ۱۸۳) ''میں اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے احکام کا متبع ہوں مبتدع نہیں یعنی کوئی نیا راستہ ایجاد کرنے والا نہیں ہوں''۔ ساری قیمت اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے آگے سر جھکانے کی ہے۔ اپنی طرف سے جو بات کی جائے اس میں وہ وزن نہیں ، اس کی کوئی قدروقیمت نہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی کبھی رات کے وقت مختلف صحابہ اکرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے حالات دیکھنے کے لئے نکلتے تھے کہ کون کیا کررہا ہے۔(ترمذی شریف)

مسنون عمل ہی بہتر ہے

ایک مرتبہ تہجد کے وقت سرکار دو عالم ﷺ اپنے گھر سے نکلے اور حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس سے گزرے، آپ ﷺ نے دیکھا کہ وہ عاجزی کے ساتھ

نہایت آہستہ آواز سے تہجد کی نماز میں تلاوت کر رہے ہیں، آگے جاکر دیکھا کہ حضرت عمر فاروقؓ تہجد پڑھ رہے ہیں اور اس میں بلند آواز سے قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہیں اور ان کی تلاوت کی آواز باہر تک سنائی دے رہی ہے۔ آپ یہ دیکھتے ہوئے واپس تشریف لے آئے۔ بعد میں آپ ﷺ نے صبح کو حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما دونوں کو اپنے پاس بلایا اور پہلے حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ رات کو میں تہجد کے وقت تمہارے پاس سے گزرا تو تم بہت آہستہ آواز سے تلاوت کر رہے تھے؟ اس کے جواب میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا کہ "اسمعت من ناجیت" یارسول اللہ جس ذات سے میں مناجات کر رہا تھا، جس سے تعلق قائم کیا تھا، جس ذات کو سنانا چاہتا تھا، اس کو چپکے چپکے سنادیا، اب آواز بلند کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے میں آہستہ تلاوت کر رہا تھا۔ پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم زور زور سے تلاوت کر رہے تھے اس کی کیا وجہ تھی؟ انہوں نے جواب دیا" انی اوقظ الوسنان واطرد الشیطان " میں زور سے اس لئے تلاوت کر رہا تھا کہ جو لوگ سوئے پڑے ہیں وہ بیدار ہو جائیں اور شیطان بھاگ جائے، اس لئے جتنی زور سے تلاوت کروں گا شیطان بھاگ جائے گا۔ اب ذرا دیکھئے کہ دونوں کی باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ صدیق اکبرؓ کی بات بھی صحیح کہ میں تو اللہ میاں کو سنا رہا ہوں، کسی دوسرے کو سنانے کا کیا مطلب؟ اور فاروق اعظمؓ کی بات بھی صحیح ہے کہ اگر آہستہ پڑھوں تو نیند آنے لگے گی، اس لئے زور سے پڑھ رہا تھا تا کہ نیند بھی بھاگ جائے اور شیطان بھی بھاگ جائے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے صدیق اکبرؓ سے فرمایا ارفع قلیلا کہ تم اپنی آواز ذرا بلند کرو اتنی

آہستہ آواز نہ کرو۔ اور حضرت فاروقؓ سے فرمایا اخفض قلیلا کہ تم تھوڑا سا آواز کو پست کرو اتنا تیز مت پڑھا کرو۔ عن یعنی تم دونوں درمیانہ راستہ اختیار کرو۔(۱) کیونکہ قرآن کریم کی آیت نازل ہوئی تھی۔

﴿ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴾

''کہ نماز کے اندر نہ تو بہت زور سے قرات کرو اور نہ بہت آہستہ بلکہ دونوں کے درمیان درمیان رہو''۔ (سورۃ الاسراء:۱۱۰ پ ۱۵)

اب غور فرمایئے! نبی کریم ﷺ صدیق اکبرؓ سے فرما رہے ہیں کہ تم ذرا اونچا پڑھو اور فاروق اعظمؓ سے فرما رہے ہیں کہ تم ذرا پست آواز میں پڑھو آخر کیوں؟ اس لئے کہ اے فاروق تم نے اپنی رائے سے یہ راستہ اختیار کیا کہ زور سے پڑھنا چاہیئے یہ اتنا پسندیدہ نہیں، بلکہ اللہ نے جوفرمایا کہ نہ زیادہ زور سے پڑھو اور نہ زیادہ آہستہ پڑھو اس میں زیادہ نور و برکت ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عبادت کے اندر اپنی سمجھ سے کوئی راستہ اختیار کرلینا اگر رسول اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے راستہ سے ذرا بھی مختلف ہے تو وہ راستہ اللہ کے نزدیک اتنا زیادہ پسندیدہ نہیں جتنا کہ اللہ اور اللہ کے رسول اکرم ﷺ کا بتایا ہوا راستہ پسندیدہ ہے۔ دین میں اطاعت اورعبادت، ساری کی ساری اللہ اوراللہ کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق ہونی چاہیئے، اپنی طرف سے کوئی طریقہ گھڑ لینا درست نہیں ہے۔

ایک بزرگ کا عبرت آموز واقعہ

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ بیان

فرمایا جسے حضرت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ نے اپنے کسی وعظ میں بھی بیان فرمایا ہے کہ ایک بزرگ،جب نماز پڑھا کرتے تھے تو آنکھیں بند کرلیتے تھے۔ اور فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ آنکھیں بند کرکے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ لیکن اگر کسی کو اس کے بغیر خشوع حاصل نہ ہوتا ہوتو جائز ہے، کوئی گناہ نہیں ہے۔ تو وہ بزرگ جب نماز پڑھتے تھے تو ساری نماز سنت کی رعایت کے ساتھ پڑھتے لیکن آنکھیں بند کرکے نماز پڑھتے تھے۔ لوگوں میں آپ کی نماز کا طریقہ مشہور تھا کیونکہ نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور صاحب کشف بھی تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی یا اللہ ! میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں جو نماز پڑھتا ہوں آپ کے ہاں قبول بھی ہے کہ نہیں اور اس کی صورت آپ کے ہاں کیا ہے، وہ مجھے دکھا دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ درخواست اس طرح قبول فرمائی کہ خواب میں یا عالم مکاشفہ میں ایک نہایت حسین وجمیل عورت سامنے لائی گئی جس کے سر سے لے کر پاؤں تک تمام اعضاء میں نہایت تناسب اور توازن تھا لیکن آنکھوں میں بینائی نہیں تھی، فرمایا گیا کہ یہ ہے تمہاری نماز جوتم پڑھتے ہو۔ انہوں نے پوچھا یا اللہ اتنے اعلیٰ درجے کی خاتون ہے لیکن اس کی آنکھیں کہاں ہیں؟ فرمایا کہ جوتم نماز پڑھتے ہوتو آنکھیں بند کرلیتے ہو، اس لئے تمہاری نماز اندھی ہے۔

اصل سنت آنکھیں کھول کر ہی نماز پڑھنا ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بات دراصل یہ تھی کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے نماز کا جو سنت طریقہ بتایا وہ

یہ ہے کہ آنکھیں کھول کر نماز پڑھنی چاہیے اور سجدے کی جگہ پر نگاہ ہونی چاہئے۔ اگر چہ فقہاء کرام نے یہ فرمایا ہے کہ اگر خیالات بہت آتے ہیں اور خیالات کو دور کرنے کے لئے آنکھیں بند کر کے نماز پڑھتا ہے تو جائز ہے مگر پھر بھی خلاف سنت ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ساری عمر آنکھیں بند کر کے نماز نہیں پڑھی اور صحابہ کرامؓ نے بھی کوئی نماز آنکھیں بند کر کے نہیں پڑھی، اس لئے آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنے میں سنت کا نور نہ ہوگا۔(۱)

نماز اتباعِ سنت میں پڑھی جائے

فقہاء کرام نے جو فرمایا ہے کہ نماز میں خیالات بہت ہوں تو آنکھیں بند کر کے نماز پڑھو تو یہ ایک جواز کی صورت ہے جو اصول شریعت میں غور کرنے سے معلوم ہوئی ہے۔ چونکہ عوام کے حالات مختلف ہوتے ہیں اس لئے فقہاء کرام نے آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنے کو بھی جائز قرار دیا لیکن فضیلت اسی میں ہے کہ انسان خشوع کے لئے بھی یہ صورت اختیار نہ کرے۔ چونکہ یہ بظاہر مسنون صورت سے ہٹ کر ایک شکل ہے اور آنکھیں کھول کر پڑھنا مسنون طریقہ ہے،اگر آنکھیں کھول کر نماز پڑھنے میں خیالات آتے ہیں اور غیر اختیاری طور پر آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ لہٰذا جو نماز آنکھ کھول کر اتباع سنت میں پڑھی جارہی ہے اور اس میں خیالات غیر اختیاری طور پر آرہے ہیں وہ نماز پھر بھی اس نماز سے اچھی ہے جو آنکھ بند کر کے پڑھی جارہی ہو کیونکہ آنکھیں کھول کر جو نماز پڑھی جارہی ہے وہ نبی کریم ﷺ کے اتباع میں پڑھی جارہی ہے جبکہ آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنا اتباع سنت میں نہیں ہے۔

غرض سارا معاملہ اتباع کا ہے ، ہم نے اپنے پاس سے جو طریقہ اختیار کرلیا کہ فلاں عبادت اس طرح ہوگی اور فلاں اس طرح ہوگی ، یہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاں رسول اللہ ﷺ کی سنت کے خلاف ہونے کی وجہ سے غیر مقبول ہوں گی۔ اس لئے فرمادیا کل بدعة ضلالة کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

بدعت کا صحیح مفہوم

آج کل ایک سوال بکثرت لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ اگر ہر نئی بات گمراہی ہے تو یہ پنکھا اور ٹیوب لائٹ ، بس اور موٹر وغیرہ بھی گمراہی ہے، کیونکہ یہ چیزیں بھی حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں نہیں تھیں یہ چیزیں بھی اب پیدا ہوئیں ہیں ، ان کو بھی بدعت کہنا چاہئے؟ خوب سمجھ لیجئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بدعت کو جونا جائز وحرام قرار دیا ہے یہ وہ بدعت ہے جو دین کے اندر نئی بات نکالی جائے اور یہ کہا جائے کہ یہ بھی دین کا جزو اور حصہ ہے۔ جیسے یہ کہا جائے کہ ایصال ثواب اسی طرح ہوگا کہ تیجہ دسواں چہلم وغیرہ کرو اور جو اس طریقے سے ایصال ثواب نہ کرے وہ مردود ہے۔ (معاذ اللہ)

جس کے گھر میں صدمہ ہوان کے لئے کھانے کا حکم

حضور اقدس ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ جس کے گھر میں صدمہ ہوتو دوسروں کو چاہئے کہ اس کے گھر میں کھانا بھیجیں۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ غزوہ موتہ کے وقت شہید ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ

اصنعوا لآل جعفر طعاما فقد جاء هم ما یشغلهم(۱) کہ جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا بنا کر بھیجو اس لئے کہ وہ بیچارے صدمے کے اندر ہیں۔ تو حضور اکرم ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ کھانا اس کے لئے بنائے جس کے ہاں صدمہ ہو گیا ہوتا کہ وہ کھانا بنانے میں مشغول نہ ہو۔ آج الٹی گنگا یہ بہتی ہے کہ جس کے گھر صدمہ ہے وہ کھانا بنائے اور نا صرف کھانا بنائے بلکہ دعوت کرے، شامیانے لگائے ، دیگیں چڑھائے ، اور اگر لوگوں کو دعوت نہیں دے گا تو برادری میں ناک کٹ جائے گی۔ یہاں تک سننے میں آیا ہے کہ مرنے والے کو بھی برا بھلا کہنا شروع کر دیا جاتا ہے کہ مر گیا مردود نہ فاتحہ نہ درود۔ گویا اگر میت کے گھر میں دعوت نہ ہوئی تو اس کی بخشش نہیں ہوگی (معاذ اللہ) پھر ستم یہ کہ وہ دعوت بھی مرنے والے کے ترکے سے ہوتی ہے جس میں سارے وارثوں کا حق ہوتا ہے ، ان میں نابالغ بھی ہوتے ہیں جن کے مال کو ذرا برابر چھونا بھی شرعا حرام ہے اور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ مگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور جو کوئی نہ کرے وہ مردود ہے۔

بدعت اصل میں کسی چیز کو دین کا حصہ بنانے کا نام ہے

یاد رکھیں دین کا حصہ بنا کر اور ضروری قرار دے کر جو چیز ایجاد کی جائے وہ بدعت ہے ۔لیکن اگر کسی نے کوئی چیز صرف اپنے استعمال کے لئے دین کا حصہ بنائے بغیر اختیار کر لی جیسے ہوا حاصل کرنے کے لئے پنکھا بنالیا یا روشنی حاصل کرنے کے لئے بجلی استعمال کر لی یا موٹر کار سفر کے لئے استعمال کر لی تو یہ کوئی بدعت نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا کے کام میں اللہ تعالیٰ نے چھوٹ دے رکھی ہے

کہ مباحات کے اندر رہتے ہوئے جو چاہو کرو۔ لیکن دین کا حصہ بنا کر کسی غیر مستحب کو مستحب قرار دے کر، کسی غیر سنت کو سنت کہہ کر، غیر واجب کو واجب کہہ کر جب کوئی چیز ایجاد کی جائے گی وہ بدعت اور حرام ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بدعت سے احتراز

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بدعت سے بہت پرہیز کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں ایک مرتبہ نماز پڑھنے کے لئے مسجد تشریف لے گئے۔ اذان کے بعد ابھی نماز کھڑی نہیں ہوئی تھی کہ مؤذن نے لوگوں کو جمع کرنے کے لئے ''الصلوٰۃ'' دوبارہ کہہ دیا تاکہ جو لوگ نہیں آئے ہیں وہ بھی آجائیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ سنا تو اپنے ساتھ جو ساتھی تھے اس سے کہا مجھے یہاں سے نکالو کیونکہ یہاں یہ شخص بدعت کررہا ہے۔(۱) کیونکہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے اذان کا جو طریقہ بتایا تھا وہ تو ایک مرتبہ ہوتی ہے، دوبارہ اعلان کرنا یہ حضور اکرم ﷺ کا طریقہ نہیں ہے، لہٰذا یہ اختیار کردہ طریقہ بدعت ہے، اس لئے مجھے اس مسجد سے نکالو میں جارہا ہوں۔

حضرت صدیقؓ کی بدعت سے احتیاط

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بدعت سے انتہا درجہ پرہیز کرتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم پہلے ایک کتابی شکل میں نہیں تھا بلکہ حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں جب آیتیں نازل ہوتی تھیں تو آپ ﷺ صحابہ کرام کو بلاکر ان آیات کو کسی ہڈی یا چمڑے پر اور کسی کپڑے یا پتوں پر لکھوادیتے تھے۔ اس طرح مختلف

آیتیں مختلف طریقوں سے جمع تھیں۔ لیکن کتابی شکل کے اندر زمانہ رسالت میں قرآن پاک کی آیات جمع نہ تھیں۔ قرآن پاک کے بے شمار حفاظ تھے اور پھر ہر ایک کے پاس آیات لکھی ہوئی بھی تھیں لیکن الگ الگ لکھی ہوئی تھیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں جب بہت سے ''حفاظ قرآن'' شہید ہوگئے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا گیا کہ آپ قرآن پاک کے مختلف پھیلے ہوئے حصوں کو کتابی شکل میں جمع کرا کے ایک جگہ محفوظ کردیں۔ ایسا نہ ہو حفاظ کرام شہید ہورہے ہیں تو خدا نہ کرے ان کے ساتھ ساتھ قرآن کریم بھی ضائع ہو جائے۔ یہ بات حضرت صدیقِ اکبرؓ کے دل کو لگی ۔ لیکن جب حضرت فاروق اعظم اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تو پہلی بات صحابہ کرام نے جو کہی وہ یہ تھی کہ جب حضور ﷺ نے یہ کام نہیں کیا تو ہم یہ کام کریں یا نہ کریں؟ کہیں ایسا کرنا بدعت نہ ہوجائے۔ اب دیکھیں صحابہ کرام کو اتنا ڈر ہے کہ قرآن کریم کا جمع کرنا بظاہر اس میں خیر ہی خیر ہے، برائی کا کوئی اس میں امکان نہیں اس کے باوجود اس کے بارے میں یہ اندیشہ پیدا ہورہا ہے کہ کہیں بدعت نہ ہو جائے۔

بدترین چیزیں محدثات ہیں

سرکاردوعالم ﷺ اس حدیث کے اندر جہاں ہمیں اس بات سے ڈرارہے ہیں کہ دشمن کا لشکر صبح یا شام تم پر آیا چاہتا ہے، تو وہاں ساتھ ساتھ آئندہ کی گمراہیوں سے بچنے کے لئے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ بدترین چیزیں محدثات ہیں۔ یعنی وہ چیزیں جو انسانوں نے اپنی طرف سے گھڑلی ہیں اور انہیں دین کا حصہ بنادیا

ہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے یہ طریقہ نہیں بتایا۔ لہٰذا اس سے پرہیز کرو ورنہ یہ چیز گمراہی کی طرف لے جائے گی۔

سرکار دو عالم ﷺ سے بڑھ کر کوئی خیر خواہ نہیں

حضور اکرم ﷺ نے ایک لمبی حدیث میں یہ جملہ ارشاد فرمایا ''انا اولی بکل مومن من نفسہ'' میں ہر مومن سے اس کی جان سے زیادہ قریب ہوں۔(۱) یعنی انسان خود اپنی جان کا اتنا خیر خواہ نہیں ہوسکتا جتنا میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ جیسے باپ اپنے بچے پر شفقت کرتا ہے کہ اپنے اوپر مشقت اور محنت جھیل لیتا ہے مگر اولاد کی تکلیف برداشت نہیں کرسکتا۔ لہٰذا جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں، وہ کوئی اپنے مفاد کی خاطر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ تمہارے فائدے کے لئے کہہ رہا ہوں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ قوم کہیں گمراہی میں مبتلا ہوکر اپنے آپ کو جہنم کا مستحق نہ بنالے۔

دنیا کے معاملہ میں بھی آپ ﷺ بہترین خیرہ خواہ ہیں

آپ ﷺ کا ارشاد ہے'' من ترك مالا فلا هله ومن ترك دينا اوضياعا فالی علی '' (حوالہ بالا) میں صرف دین کے معاملہ میں تمہارا خیر خواہ نہیں ہوں بلکہ دنیا میں بھی تمہارا خیر خواہ ہوں، اگر کوئی شخص مال چھوڑ کر گیا ہے تو وہ میراث اس کے گھر والوں کے لئے ہے اور شریعت کے مطابق وہ میراث آپس میں تقسیم کرلیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے اوپر قرضہ چھوڑ گیا اور ترکہ میں اتنا مال نہیں ہے کہ اس کا قرضہ ادا کیا جائے یا ایسی اولاد چھوڑ گیا جس کی کفالت کرنے والا کوئی

نہیں ہے تو وہ قرضے اور اولاد میرے پاس لے آؤ، میں زندگی بھر کفالت کروں گا۔ میں جو کچھ تمہیں کہہ رہا ہوں وہ خیر خواہی کے لئے کہہ رہا ہوں، تم سے کوئی پیسے اور اجرت کا مطالبہ نہیں ہے۔ جیسا کہ پیچھے گزرا تھا کہ میں تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر تمہیں جہنم سے روکنا چاہتا ہوں اور تم گرے جا رہے ہو۔ میں تمہیں پکار رہا ہوں کہ خدا کے لئے ان گناہوں سے بچ جاؤ اور ان بدعتوں سے بچ جاؤ تاکہ تم اس عذاب سے جہنم سے نجات پالو۔ (صحیح بخاری کتاب الرقاق باب الانتہاء عن المعاصی جلد ۲ صفحہ ۹۶۰)

دل سے نکلی ہوئی بات اثر رکھتی ہے

یہ حضور ﷺ کی وہ باتیں تھیں جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی میں انقلاب برپا کردیا اور ایسی تبدیلیاں آئیں کہ ایک ایک صحابی کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا۔ جب بات دل سے نکلتی تھی دل پر اثر کرتی تھی اس لئے سرکار دو عالم ﷺ کے ایک ایک جملے نے لوگوں کی زندگیاں بدل دیں۔ آج ہم گھنٹوں تقریر اور باتیں کرتے ہیں لیکن دل ٹس سے مس نہیں ہوتا اس لئے کہ کہنے والا خود اس پر کاربند نہیں ہے۔ اور ہمارے دل میں وہ جذبہ اور درد نہیں ہے جس کے ذریعے سرکار دو عالم ﷺ کی باتوں سے صحابہ کرام کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہوا۔ آج بھی جتنا اثر براہ راست کتاب اللہ کے کلمات میں اور نبی کریم ﷺ کے کلمات میں ہے کتنی ہی لچھے دار تقریریں کرلو، اس سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو حضور ﷺ کا ایک کلمہ سن کر دل پر اثر ہوتا ہے۔

بدعت کی حقیقت

بعض حضرات جو کہتے ہیں کہ بدعت کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک بدعت

حسنہ اور ایک بدعت سیئہ۔ یعنی بعض کام بدعت تو ہیں لیکن اچھے ہیں اور بعض کام ایسے ہیں جو بدعت ہیں لیکن برے ہیں لہٰذا اگر کوئی اچھا کام شروع کیا جائے تو اس کو بدعت حسنہ کہا جائے گا اور اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ خوب سمجھ لیں کہ بدعت کوئی اچھی نہیں ہوتی، جتنی بدعتیں ہیں وہ سب سیئہ ہیں کوئی حسنہ نہیں ہے۔ بدعت کے دو معنی ہوتے ہیں ایک لغوی اور دوسرا اصطلاحی، اگر آپ بدعت کے معنی لغت اور ڈکشنری میں دیکھیں تو لغت میں اس کے معنی ہر نئی چیز کے آتے ہیں، یہ پنکھا بجلی ٹرین اور ہوائی جہاز لغت اور ڈکشنری کے اعتبار سے سب بدعت ہیں۔ لیکن شریعت کی اصطلاح میں بدعت کے معنی ہر نئی چیز کے نہیں ہیں بلکہ بدعت کے معنی دین میں کوئی ایسا طریقہ نکالنا اور پھر اس طریقے کو مستحب، لازم یا مسنون قرار دینا جس کو نبی کریم ﷺ یا خلفاء راشدین نے مسنون قرار نہیں دیا یہ بدعت کہلائے گا۔ اس معنی کے لحاظ سے کوئی بدعت اچھی نہیں ہوتی بلکہ ایسی ہر بدعت سیئہ اور برائی ہے۔

بعض امور میں کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں

یہ بات سمجھنے کی ہے، بسا اوقات لوگوں کو اس میں کافی غلطی پیش آتی ہے کہ کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ نے مباح قرار دی ہیں یا کچھ چیزیں مسنون، مستحب اور باعث اجروثواب قرار دی ہیں، لیکن ان اجروثواب کی چیزوں میں کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا کہ اس طرح کرو گے تو ثواب زیادہ ہے اور اس طرح کرو گے تو ثواب کم ہے بلکہ جو طریقہ بھی بجا لایا جائے وہ ثواب ہوتا ہے۔

ایک واضح مثال

اس کی مثال کسی مردے کو ایصال ثواب کرنا ہے جو کہ بڑی فضیلت کی چیز ہے۔ جو شخص کسی مرنے والے کو ایصال ثواب کرے اس کو دوگنا ثواب ملتا ہے۔ ایک اس کے اپنے عمل کرنے کا ثواب جو اس نے کیا اور دوسرا کسی مسلمان کے ساتھ ہمدردی کرنے کا ثواب۔ لیکن شریعت نے ایصال ثواب کے لئے کوئی طریقہ مقرر نہیں کیا۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ ایصال ثواب صرف قرآن شریف پڑھ کر ہی کرو یا صدقہ کرکے کرو یا نماز پڑھ کر کرو بلکہ جو بھی نیک کام ہو اور جس وقت بھی اس کی توفیق ہوجائے اس کا ایصال ثواب جائز ہے۔ تلاوت کلام پاک، ذکر وتسبیح، صدقہ اور نفلی نماز پڑھ کر بھی ایصال ثواب کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح وعظ ونصیحت کے ذریعہ بھی ایصال ثواب کیا جاسکتا ہے۔ مقصد یہ کہ جتنے بھی نیکی کے کام ہیں۔ ان میں سے کسی کے لئے بھی شریعت نے ایصال ثواب کا دن مقرر نہیں کیا کہ فلاں دن کرو اور فلاں دن نہ کرو۔ جب بھی کسی کا انتقال ہوجائے اس کے بعد کوئی بھی شخص جس وقت چاہے ایصال ثواب کرسکتا ہے۔ پہلے دن کرے دوسرے دن کرے، یا تیسرے دن، جس دن چاہے کرسکتا ہے اور اس کے لئے کوئی دن مقرر نہیں ہے۔ اب کوئی شخص ایصال ثواب کا کوئی بھی ایسا طریقہ اختیار کرے جس کی شریعت نے اجازت دی ہے تو اختیار کرلینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کتاب لکھ کر ایصال ثواب کرنا

فرض کریں کہ میں نے ایک کتاب عام مسلمانوں کے فائدے کے لئے

لکھی اور کتاب کا مقصود دعوت وتبلیغ ہے۔ اور کتاب لکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ اس کتاب لکھنے کا ثواب فلاں کو پہنچا دیجئے تو یہ ایصال ثواب صحیح ہے۔ حالانکہ کتاب لکھ کر ایصال ثواب کا کام نہ تو کبھی حضور ﷺ نے کیا اور نہ صحابہ کرام نے کیا، اس لئے کہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام نے کوئی کتاب لکھی ہی نہیں ہے، لیکن ایصال ثواب کرنے کی فضیلت بیان فرمائی کہ ہر نیکی کے کام کا ایصال ثواب کر سکتے ہو۔ لہٰذا میں جو ایصال ثواب کر رہا ہوں یہ بدعت نہیں ہوگا۔ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ کتاب لکھ کر ایصال ثواب کرنے کا طریقہ دوسرے طریقوں سے زیادہ افضل اور بہتر ہے اور یہ طریقہ سنت ہے نیز اگر کوئی شخص یہ طریقہ اختیار نہیں کرے گا تو برا کرے گا، تو اس طرح یہی عمل جو باعث اجر وثواب تھا بدعت ہو جائے گا، اس لئے کہ میں نے اپنی طرف سے دین میں ایک ایسی چیز داخل کردی جو دین کا حصہ نہیں تھی۔ لہٰذا ایصال ثواب کسی بھی طریقہ سے کریں کچھ حرج نہیں لیکن اس کو دوسروں سے افضل وسنت قرار دیا جائے یا واجب کہا جائے یہ غلط ہے۔ اسی طرح فرض کریں کہ کوئی شخص تیسرے دن گھر میں بیٹھ کر ایصال ثواب کر رہا ہے تو اس میں کوئی بدعت نہیں بلکہ یہ جائز ہے۔ اگر کوئی کہے کہ تیسرا دن خاص طور پر ایصال ثواب کے لئے مقرر ہے اور تیسرے دن میں ایصال ثواب کرنا زیادہ فضیلت کا باعث اور سنت ہے یا یہ کہے کہ اگر کوئی شخص تیسرے دن نہیں کرے گا تو اس کو لعنت وملامت کا شکار ہونا پڑے گا، اب یہ ایصال ثواب بدعت ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی طرف سے اس جائز عمل کو اس دن کے ساتھ لازم اور مسنون قرار دے دیا۔

ایصال ثواب کے لئے کوئی دن خاص نہیں

حضور اقدس ﷺ نے جمعہ کے دن کی کتنی فضیلت بیان فرمائی ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں "وقلّ ما کان یفطر یوم الجمعة" (۱) حضور ﷺ جمعہ کے دن بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ روزہ سے نہ ہوں بلکہ اکثر جمعہ کے دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ اس لئے کہ یہ فضیلت والا دن روزے کے ساتھ گزرے تو اچھا ہے۔ لیکن آپ کو دیکھ کر رفتہ رفتہ لوگوں نے بھی جمعہ کے دن روزہ رکھنا شروع کردیا اور جمعہ کے دن کو روزے کے ساتھ اس طرح مخصوص کردیا جس طرح یہودی لوگ (سنیچر) ہفتہ کے دن کو مخصوص کرتے تھے، اور ان کے ہاں ہفتہ کے دن روزہ رکھا جاتا تھا، گویا سنیچر کی ان کے ہاں زیادہ فضیلت اور اہمیت تھی۔ جب آپ ﷺ نے یہ دیکھا تو آپ نے صحابہ کرامؓ کو منع فرمایا کہ جمعہ کے دن کوئی روزہ نہ رکھے، (۲) یہ اس لئے فرمایا کہ جس دن کو اللہ تعالیٰ نے روزہ کے لیے متعین نہیں کیا لوگ اپنی طرف سے اس کو متعین نہ کریں۔ اب جو میں عرض کررہا تھا، دسواں، بیسواں، تیجہ وغیرہ، یہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ لوگوں نے ان دنوں کو ایصال ثواب کے لیے مخصوص کرلیا ہے، لیکن اگر کوئی ایصال ثواب کے لیے مخصوص نہیں کررہا بلکہ اتفاقاً وہ تیسرے دن ایصال ثواب کرے تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

اسم پاک ﷺ سن کر انگوٹھے چومنا

اسی طرح کسی نے اذان سنی اور اس میں کلمہ اشهدان محمّدًا رسول

اللّٰه سنا تو اُس شخص کے دل میں سرکار دو عالم ﷺ کی محبت کا داعیہ پیدا ہوا، آپ کا اسم گرامی سنا تو محبت سے بے اختیار ہوکر اس نے انگوٹھے چوم کراپنی آنکھوں کو لگالئے تو کوئی گناہ اور بدعت کی بات نہیں، اس لیے کہ اس نے یہ بے اختیار عمل سرکار دوعالم ﷺ کی تعظیم اور محبت میں کیا۔ جبکہ سرکار دو عالم ﷺ کی محبت اور عظمت ایک قابل تعریف چیز ہے اور ایمان کی علامت ہے اور انشاء اللہ اس محبت پر اجروثواب ملے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص ساری دنیا کو یہ کہنا شروع کردے کہ جب بھی اذان میں اشهدان محمّدا رسول اللّٰه پڑھا جائے، تو تم اس وقت اپنے انگوٹھوں کو چومو! تو وہ حضور ﷺ سے محبت کرنے والا نہیں ہے کیونکہ وہ عمل جو محبت کے جذبے سے جائز تھا اب بدعت بن گیا۔ اس میں باریک فرق ہوتا ہے کہ عمل جو فی نفسہ کسی صحیح جذبے سے کیا جارہا ہے، اگر مباح طریقے سے کیا جائے تو بدعت نہیں ہے، لیکن جب اس کو لازم بنا لیا، سنت اور رسم بنالیا اور جو شخص نہ کرے اس کو مطعون کرنا شروع کردیا تو سمجھ لیں یہ بدعت ہے۔

یارسول اللہ کہنا کب بدعت ہے؟

میں یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص بیٹھا ہوا تھا، بے اختیار اس کے سامنے نبی کریم ﷺ کا اسم گرامی آیا اور دل میں اس نے نبی اکرم ﷺ کو سامنے تصور کرکے کہہ دیا الصلوٰة والسلام علیك یا رسول اللّٰه۔ حاضر ناظر کے عقیدے سے نہیں کہتا بلکہ جس طرح آدمی بعض اوقات کسی غائب کو اپنے ذہن

میں تصور کر کے پکار کر کہہ دیتا ہے، اس طرح کہا تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں یعنی اصلاً اس میں کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر اس عقیدے کے ساتھ کہا کہ حضور اقدس ﷺ یہاں پر اس طرح حاضر وناظر ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ حاضر وناظر ہیں تو یہ معاذ اللہ شرک ہو جائے گا۔ اور اگر اس عقیدے کے ساتھ تو نہ کہے لیکن یہ سوچ کر کہے کہ الصلوٰۃ والسلام علیك یارسول اللہ کہنا سنت ہے اور اس طرح درود پڑھنا ضروری ہے اور جو شخص اس طرح نہ کہے گویا اس کے دل میں حضور ﷺ کی محبت نہیں ہے تو یہ عمل بدعت ہے اور یہی چیز ضلالت اور گمراہی بن جائے گی۔

لہٰذا معمولی سے عقیدے اور عمل کے ذرا سے فرق سے ایک چیز جائز، ناجائز اور بدعت بن جاتی ہے۔ آپ دیکھیں! جتنی بدعتیں ہیں اکثر وبیشتر وہ اصلا مباح تھیں اور جائز تھیں۔ لیکن جب اس کو اس طرح لازم کرلیا جائے جس طرح فرض اور واجب ہوتے ہیں تو اس سے وہ بدعت بن جاتی ہیں۔

عید کے دن گلے ملنا

عید کے دن آپ نے عید کی نماز پڑھی اور عید کے بعد دو مسلمان بھائی خوشی کے جذبے میں آ کر آپس میں گلے مل لیے تو اصلا گلے ملنا کوئی ناجائز نہیں ہے۔ یا آپ یہاں مجلس سے اٹھیں اور کسی سے گلے مل لیں تو گناہ کی بات نہیں بلکہ جائز ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ عید کی نماز کے بعد گلے ملنا عید کی سنت ہے، گویا یہ بھی عید کی نماز کا حصہ ہے اور جب تک گلے نہیں ملیں گے اس

وقت تک عید ہوگی ہی نہیں تو یہی عمل بدعت بن جائے گا۔ کیونکہ ایک ایسی چیز کو سنت قرار دے دیا جس کو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے بھی سنت قرار نہیں دیا اور نہ ہی اس کی پابندی کی۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ میں تو گلے نہیں ملتا آپ کہیں گے کہ عید کا دن ہے کیوں گلے نہیں ملتے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ عید کے دن گلے ملنے کو آپ لازمی سمجھتے ہیں اور لازمی قرار دے دینا یہی چیز بدعت بنا دیتا ہے۔ لیکن ویسے اتفاقی طور پر گلے ملنے کو دل چاہا تو یہ بدعت نہیں ہوگا۔

کیا تبلیغی نصاب پڑھنا بدعت ہے؟

ایک صاحب پوچھ رہے تھے کہ یہ دعوت وتبلیغ کے کام میں لگنے والے لوگ فضائل اعمال کا نصاب بیٹھ کر پڑھتے ہیں، لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں اور صحابہ کرام اور خلفاء راشدین کے زمانے میں کون پڑھتا تھا؟ لہٰذا یہ بھی بدعت ہونی چاہئے۔ جو تفصیل آپ کے سامنے بیان ہوئی اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ علم دین کی بات کہنا اور اس کی تبلیغ کرنا ہر آن اور ہر وقت جائز ہے۔ جیسے جمعہ کے روز عصر کے بعد یہاں جمع ہوتے ہیں اور دین کی بات سنتے اور سناتے ہیں، اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا کہ لوگ جمعہ کے دن جمع ہوں اور دین کی بات ہو لہٰذا یہ بھی بدعت ہے تو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ اس لیے بدعت نہیں کہ دین کی تعلیم وتبلیغ ہر وقت اور ہر آن جائز ہے۔ لیکن ہم میں سے کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ جمعہ کے دن عصر کے بعد بیت المکرّم کی مسجد میں اجتماع ہونا مسنون ہے، اور اگر کوئی شخص اس

اجتماع کے اندر شریک نہ ہوتو گویا اس کو دین کا شوق نہیں ہے اور اس کے دل کے اندر دین کی عظمت اور محبت نہیں ہے تو یہی عمل جو ہم کر رہے ہیں اس وجہ سے بدعت بن جائے گا۔ اگر اب ایک آدمی یہاں نہیں آتا دوسری جگہ جاکر دین کی باتیں سن لیتا ہے تو وہ بھی ثواب کا کام کر رہا ہے۔ لہٰذا کسی بھی اجروثواب والے عمل کو اپنی طرف سے وقت اور خاص حالات کے ساتھ مربوط کر کے دینی طور پر لازم قرار دے دیا جائے تو وہی اس عمل کو بدعت بنادیتا ہے۔ حضور اقدس ﷺ کی سیرت طیبہ بیان کرنا یقیناً اجروفضیلت کا کام ہے، وہ لمحات جن میں حضور اقدس ﷺ کا ذکر کسی بھی حیثیت سے ہو وہ حاصل زندگی ہے۔ قیمتی اوقات تو وہی ہیں جو آپ ﷺ کے ذکر مبارک میں صرف ہوجائیں، لیکن اگر کوئی شخص اس کے لیے خاص طریقہ متعین کرے، خاص دن یا خاص مجلس متعین کرے اور کہے یہی طریقہ اجروثواب کا باعث اور مسنون عمل ہے تو یہ بدعت ہوگی۔

ایک آسان مثال

اس کی آسان سی مثال یوں سمجھ لیں کہ ہمیں! نماز میں التحیات کے وقت درود شریف پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اور درود شریف پڑھنا حضور اقدس ﷺ نے ہمیں سکھادیا لہٰذا اس کو پڑھنا جائز اور مسنون ہے، اب اگر کوئی شخص اللھم صل علیٰ محمّدن النبی الامی وعلی آله وصحبه وبارك وسلم اگر یہ درود پڑھ لے تو بھی جائز ہے اور اس سے بھی درود شریف کی سنت ادا ہوجائے گی۔ لیکن اگر کوئی شخص کہے کہ فلاں درودشریف نہ پڑھو! فلاں پڑھو ! اور یہی سنت

ہے۔تو اس صورت میں درود شریف پڑھنا جو بڑی فضیلت والا تھا بدعت بن جائے گا۔

ہر بدعت بری ہے

لوگوں نے جو بدعت کی قسمیں نکال لی ہیں کہ ایک بدعت حسنہ ہوتی ہے اور ایک بدعت سیئہ ہوتی ہے۔یادر کھیں! بدعت کوئی بھی اچھی نہیں ہوتی جو طریقہ نبی کریم سرور دوعالم ﷺ نے اور خلفاء راشدین اور صحابہ کرامؓ نے ضروری قرار نہیں دیا، دنیا کی کوئی طاقت اس کو واجب ، سنت یا مستحب قرار نہیں دے سکتی۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو وہ ضلالت اور گمراہی ہوگی اس کا مطلب یہ ہے کہ (نعوذ باللہ) وہ دین کو اتنا نہیں جانتے تھے جتنا ہم جانتے ہیں۔

بنیئے سے سیانا سو باؤلا

ہمارے والد ماجد قدس اللہ سرہ ایک کہاوت ہندی زبان میں سنایا کرتے تھے ''بنیئے سے سیانا سو باؤلا'' ہندو بنیئے تاجر ہوا کرتے تھے اور ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ یہ ہندو تجارت اور پیسے بڑھانے میں بہت سیانے اور چالاک ہوتے ہیں اسی لئے ان کے بارے میں یہ کہاوت مشہور تھی۔ یعنی کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں تجارت میں بنیئے سے زیادہ چالاک ہوں تو وہ درحقیقت باؤلا ہے۔ حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین دین کے سیانے ہیں ، اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں دین

میں ان سے زیادہ سیانا ہوں یعنی جن کاموں کو انہوں نے نہیں کیا یا ضروری نہیں سمجھا، میں ان کو ضروری سمجھتا ہوں تو حقیقت میں وہ باؤلا اور احمق ہے۔ خوب سمجھ لیں کہ بعض نئی چیزیں تو وہ ہوتی ہیں جن کو کوئی بھی شخص دین کا حصہ نہیں سمجھتا۔ مثلاً یہ پنکھا لائٹ وغیرہ یہ چیزیں اس لیے بدعت نہیں ہیں کہ ان کوکوئی بھی دین کا حصہ اور ضروری نہیں سمجھتا۔ اور دین کے جن کے کاموں کوانجام دینے کا اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا ان کو جس طرح چاہو ادا کرلو، ان کاموں کے لئے جب کوئی خاص طریقہ مقرر کرلیا جائے اور اس طریقہ کو دین کا حصہ قرار دیا جائے تو وہ بدعت بن جائے گا۔ یہ بات اگر ذہن میں رہے تو برے خیالات خود بخود دور ہوجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بدعت سے اجتناب کی توفیق عطا فرمائے اور دین کی صحیح فہم عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

امت مسلمہ کی معیشت

موضوع ■ امت مسلمہ اور اس کی معیشت

خطاب انگریزی ■ جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

اردو ترجمہ ■ ڈاکٹر مولانا محمد عمران اشرف عثمانی صاحب

تاریخ ■ ستمبر ۱۹۹۷ء

باہتمام ■ محمد ناظم اشرف

ناشر ■ بیت العلوم۔ ۲۰ نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی، لاہور

فون: ۷۳۵۲۲۸۳

امت مسلمہ کی معیشت اور
اسلامی خطوط پر اس کا اتحاد

''اکیسویں صدی اور مسلم امہ'' کے موضوع پر موتمر العالم الاسلامی نے اسلام آباد میں ۲۴ ستمبر کو ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جس میں شیخ الاسلام جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ کو مذکورہ بالا موضوع پر خطاب کی دعوت دی گئی۔ موصوف نے اس موقع پر انگریزی میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس مقالے کا اردو ترجمہ ذیل میں پیش خدمت ہے۔

محترم چیئرمین اور معزز مہمانان گرامی :

یہ میرے لئے ایک بڑا اعزاز ہے کہ مجھے ایسی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا موقع مل رہا ہے جو موتمر العالم الاسلامی مسلمانوں کی تاریخ کے ایک انتہائی نازک وقت میں منعقد کر رہی ہے، نئی صدی کا ظہور پورے عالم میں فکر وعمل کے نئے افق کھول رہا ہے، ہمارے لئے مسلم امہ ہونے کی حیثیت سے اپنے اہم مسائل اور مشکلات پر غور کرنا، ان کے رخ متعین کرنا، اور آنے والے وقتوں کے بین

الاقوامی مسائل حل کرنے کے لئے اپنی حکمت عملی وضع کرنا ایک لائق تحسین عمل ہے، میں موتمر العالم الاسلامی کا شکر گذار ہوں کہ مجھے ایسا پروقار فورم (Forum) مہیا کیا جس میں ان مسائل پر گفتگو کر سکتا ہوں۔

انیسویں صدی سیاسی استبداد کی صدی تھی، جس میں یورپی طاقتور اقوام نے ایشیائی اور افریقی ممالک بشمول اسلامی ممالک پر اپنا تسلط جمایا ہوا تھا، موجودہ صدی نے جو اب اپنے آخری سانس لے رہی ہے مغربی استعمار کی طرف سے آزادی کے تدریجی عمل کا مشاہدہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہی وہ صدی تھی، جس میں بہت سے اسلامی ممالک نے یا تو طاقت کے بل بوتے پر یا پُرامن طریقوں سے آزادی حاصل کی، تاہم اپنی سیاسی آزادی کے حصول میں واضح کامیابی کے باوجود ہم اب تک علمی، معاشی اور منصوبہ سازی کے میدانوں میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے، یہی وجہ ہے کہ اب تک مسلم امہ سیاسی آزادی کے صحیح ثمرات سے لطف اندوز نہیں ہو سکی ہے۔

اب مسلم دنیا نئی صدی کو اس امید کے ساتھ دیکھ رہی ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ یہ اس کے لئے مکمل اور حقیقی آزادی لے کر آئی گی، جس میں مسلمان دنیا کی مختلف اقوام کے درمیان اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کریں اور قرآن کریم اورحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں وضع کردہ اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گذارنے میں آزاد ہوں۔

تاہم یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ امید صرف خوابوں اور خواہشات سے پوری نہیں ہو سکتی، اپنے اس محبوب مقصد کے حصول کے لئے ہمیں اجتماعی زندگی کے تمام میدانوں میں اپنے رویہ کو بدلنا ہوگا، اور جس قدر ہم نے سیاسی آزادی کے

حصول کے لئے کوششیں کیں اس سے زیادہ ہمیں اپنی مکمل آزادی کے حصول کی کوششیں کرنی ہوں گی، ہمیں اپنے لائحہ عمل اور منصوبوں پر ازسرنو غور کرنا ہوگا، ہمیں خوب غور وفکر کے ساتھ مرتب کردہ پلاننگ اور منصوبہ سازی کی ضرورت ہوگی، ہمیں اپنے متعین اور واضح مقاصد کے لئے اجتماعی قوت ارادی، انقلابی اقدامات اور ایک پرجوش پروگرام کی ضرورت ہوگی، اور اس طرح کے بین الاقوامی سیمیناروں سے اگر بھرپور فائدہ اٹھایا جائے تو اس مقصد کی طرف سنجیدہ فکر کو آگے بڑھانے میں مدد مل سکتی ہے۔

جس موضوع کے بارے میں مجھ سے اس عظیم فورم میں چند الفاظ پیش کرنے کے لئے کہا گیا ہے وہ موضوع ''امت مسلمہ کی معیشت کا اسلامی خطوط پر اتحاد'' ہے، اس مختصر مضمون میں جو ایک مختصر نوٹس پر تیار کیا گیا ہے احقر اپنے آپ کو ایسے دو نکات تک محدود رکھے گا جو ہمارے لئے امت مسلمہ ہونے کی حیثیت سے بہت زیادہ اہم ہیں۔

(۱) خود ساختہ انحصار

یہ بات ہرکس و ناکس جانتا ہے کہ تقریباً تمام مسلم ممالک کا سماجی اور معاشی میدانوں میں دوسروں پر انحصار اس امت کا ایسا معاشی مسئلہ بن چکا ہے کہ جس سے آج تمام مسلم امت دوچار ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اکثر مسلمان ممالک، مغربی ممالک یا بین الاقوامی (بلکہ حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو مغربی) مالیاتی یا تمویلی اداروں سے بڑی بڑی رقمیں قرض لے رہے ہیں، اور بعض ممالک یہ بھاری مقدار میں سودی قرضے کسی ترقیاتی منصوبوں کے بجائے اپنے

روزمرہ کے اخراجات کے لئے لے رہے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ تشویشناک امر یہ ہے کہ اپنے سابقہ سود کی ادائیگی کے لئے حاصل کر رہے ہیں، جس سے ان کے حاصل کردہ قرضوں کا سائز خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔

بیرونی قرضوں پر انحصار ہماری ایک ایسی بنیادی بیماری ہے جس کی وجہ سے ہماری اقتصادی زندگی اس درجہ متاثر ہو چکی ہے کہ قومی خود اعتمادی تقریباً مفقود ہوتی جا رہی ہے، اور اس نے ہمیں اس بات پر مجبور کر رکھا ہے کہ ہم اپنے قرض دہندوں کے مطالبات کے آگے بلکہ بعض اوقات ایسے مطالبات کے آگے سرتسلیم خم کر دیں جو ہمارے اجتماعی مفادات کے خلاف ہیں، یہ بات بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ قرض دہندہ قرضے دینے سے قبل مقروض پر اپنی شرائط عائد کر دیتے ہیں، یہ شرائط ہمیں مستقل غیر ملکی دباؤ میں رکھتی ہیں، اور اکثر ہمیں اپنے حقیقی مقاصد کے حصول سے روکتی ہیں، اور اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ ہم اغیار کے بتائے ہوئے راستوں پر چلیں، خلاصہ یہ کہ غیر ملکی قرضوں کے برے نتائج اتنے واضح ہیں کہ محتاج بیان نہیں ہیں۔

قرضہ لینا اسلامی تعلیمات کی رو سے اس قدر ناپسند فعل ہے کہ اس میں شدید مجبوری اور سخت ضرورت کے بغیر مبتلا نہیں ہونا چاہئے، جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی نماز جنازہ ادا کرنے سے انکار فرما دیا جو اپنا قرض ادا کئے بغیر وفات پا گیا تھا۔ (رواہ البخاری عن المشکوٰۃ باب الافلاس والا نظار جلد ا صفحہ ۲۵۲)

مزید برآں مسلمان فقہاء کرام نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آیا کسی مسلمان ملک کے حکمران کے لئے جائز ہے کہ وہ غیر مسلموں کی طرف سے پیش کردہ تحفے

قبول کرے؟ اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ صرف اس صورت میں جائز ہے کہ جب ان تحفوں کی وجہ سے امت مسلمہ کے مفاد کے خلاف کسی قسم کا دباؤ نہ ہو، یہ جواب تحفے قبول کرنے کے بارے میں دیا گیا ہے، اب آپ اس سے خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قرضے لینے کا جواب کیا ہوگا؟

اسلامی اصولوں کے مطابق بیان کردہ یہ ہدایات اس بات کا مطالبہ کرتی ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے سختی اور تنگی کے زمانہ میں بھی غیر ملکی قرضے لینے سے انکار کرنا چاہئے، لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ موجودہ قرضے ہمارے وسائل (Resources) کی قلت کے باعث پیدا نہیں ہوئے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی جتنے آج مالدار ہیں اس سے قبل مسلمان کی پوری تاریخ میں اتنے مالدار کبھی نہیں رہے، آج ان کے پاس قدرتی وسائل کے عظیم خزانے موجود ہیں، دنیا کے اہم دفاعی و اقتصادی اہمیت کے حامل مقامات ان کے قبضے میں ہیں، وہ دنیا کے بیچوں بیچ واقع ہیں، وہ مراکش سے انڈونیشا تک ایسی جغرافیائی زنجیر میں جڑے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان سوائے اسرائیل اور ہندوستان کے کوئی ملک حائل نہیں ہے، وہ دنیا کا تقریباً پچاس فیصد تیل پیدا کرتے ہیں، دنیا کی خام مال کی برآمدات میں تقریباً چالیس فیصد حصہ ان کا (مسلمانوں کا) شمار کیا جاتا ہے۔ ان تمام حقائق کے علاوہ مسلمانوں کی وہ تمام نقد رقوم جو مغربی ممالک میں امانت یا سرمایہ کاری کی غرض سے رکھی گئی ہیں اتنی زیادہ ہیں کہ وہ خود اپنے اوپر عائد تمام دیون (Loans) اور واجبات (Payables and dues) کی ادائیگی کے لئے مکمل کافی ہیں۔

اسلامی ترقیاتی بنک کی حالیہ رپورٹ کے مطابق اسلامی ترقیاتی بنک

(IDB) کے رکن ممالک کے بیرونی قرضہ جات کا مجموعہ 618.8 بلین ڈالر ہے، جب کہ دوسری طرف مسلمانوں کے مغربی ممالک میں رکھے ہوئے اثاثے اور امانتیں (Deposits) اس سے کہیں زیادہ ہیں(۱)۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ان اثاثوں اور امانتوں کا کوئی ٹھوس ریکارڈ نہیں ہے، کیونکہ ان کے مالکان متعدد وجوہات کی بناء پر انہیں ظاہر نہیں کرتے ہیں، البتہ معاشی ماہرین کا خیال ہے کہ خلیج کی جنگ (Gulf war) کے بعد عرب مسلمانوں نے اپنے 250 بلین ڈالر نکال کر اپنے ممالک میں جمع کرائے تھے، ان کے علاوہ مسلمانوں کے مغربی ممالک میں جمع شدہ اثاثوں اور امانتوں کا تخمینہ تقریبا ۸۰۰ سے لے کر ۱۰۰۰ بلین ڈالرز کے درمیان ہے(۲)۔ اس بات کا عملاً مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی ہی جمع کردہ رقم کا ایک حصہ خود ہی زیادہ سودی قیمت پر قرض لے رہے ہیں۔

اور اگر بالفرض ان تخمینی اعداد و شمار کو مبالغہ آمیز سمجھا جائے تب بھی اس حقیقت سے شاید ہی کوئی منکر ہوسکتا ہے کہ اتنی بڑی رقموں کو اگر اپنے پاس ہی رکھ کر صحیح طریقے سے مسلمان دنیا پر استعمال کیا جاتا تو امت مسلمہ کبھی چھ سو بلین یا اس سے زائد قرضے لینے پر مجبور نہ ہوتی۔

اس زاویہ سے اگر جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ غیر ملکی قرضوں پر انحصار درحقیقت ہمارا خود ساختہ ہی ہے، جس کے بارے میں ہم کسی دوسرے پر الزام نہیں لگا سکتے، ہم نے کبھی بھی ان عوامل کو دور نہیں کیا جو ہمارے سرمائے کی باہر منتقلی کے ذمہ دار ہیں۔ ہم نے اپنے لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، ہم نے اپنے آپ کو موجودہ ظالمانہ اور بدعنوان (Corrupt) نظام محصولات سے چھٹکارا نہیں دیا، ہم کبھی سرمایہ کاری کے لئے ایک پرامن فضا قائم کرنے کے

قابل نہیں ہوئے، ہم نے کبھی اپنے ممالک کو ایک مضبوط سیاسی نظام عطا نہ کیا، ہم نے کبھی بھی اپنے مجموعی سرمایہ سے بہترین طریقوں سے استفادہ کرنے کے موقع پر غور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی، مزید برآں مجموعی طور پر ہم اسلامی اتحاد کے جذبات کو سرگرم اور امت مسلمہ کی طاقت کو متحرک کرنے میں ناکام رہے۔

یہ افسوسناک صورت حال نئی صدی کی خوشی میں مہنگی تقاریب منعقد کر لینے سے ٹھیک نہیں ہو سکتی، ہمیں سنجیدگی کے ساتھ وقت کے چیلنج کو قبول کرنا ہوگا، جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے ہمارے معاشی اور سیاسی قائدین کو غیر ملکی انحصار سے نجات دلانے کے لئے ایسے ذرائع اور طریقے تلاش کرنے ہوں گے جو ہمارے پاس پہلے ہی سے دستیاب ہیں، جس چیز کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم مسلم امہ کی باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لئے نئی پالیسیاں وضع کریں، قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

"اِنَّمَا الْمُؤمِنُونَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوااللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" (سورۃ الحجرات:۱۰ پ ۲۶)

"تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے"۔

قرآن و سنت کی تعلیمات اور احکام اس اصول کی تاکید کرتے ہیں کہ تمام مسلم امہ کو یک جان ہو کر کام کرنا چاہئے، جغرافیائی حدود انہیں مختلف مقاصد اور مختلف اقوام کے اندر منقسم نہیں کرسکتیں، سیاسی و جغرافیائی حدود صرف کسی ملک کے انتظامی و داخلی امور نمٹانے کے لئے برداشت کی جاسکتی ہیں، لیکن تمام مسلم ممالک کو خصوصاً ان کے اپنے مشترک مقاصد کے لئے بقیہ دنیا کے مقابلے میں

یک جان اور یک رخ ہو کر رہنا چاہئے۔

اب وہ دن چلے گئے جب تکنیکی مہارت پر صرف چند مغربی ممالک کی اجارہ داری تھی، اب مسلمانوں کی مہارت و قابلیت (Talent) کم از کم مسلمانوں کی فوری ضروریات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس امت کی خدمت کے لئے مذہبی جذبہ کے ساتھ اس قابلیت کو تلاش کریں، لیکن یہ مقصد ہمارے ممالک کے قائدین اور زعماء کی متحدہ کوششوں کا طلبگار ہے۔ یہی ان کا سب سے بڑا چیلنج ہے، جس کا مقابلہ ان کے لئے نہ صرف امت کی بھلائی کی خاطر بلکہ خود اپنی بقاء اور حیات کے لئے ضروری ہے، اس بارے میں ایک عظیم ذمہ داری آرگنائزیشن آف اسلام کانفرنس (OIC) کے کاندھوں پر ہے، کہ اسے خود آگے بڑھ کر مسلمان قابلیت کا ایک متحدہ تالاب (Pool) بنانا چاہئے۔

(۲) اپنے معاشی نظام کی تعمیر نو

دوسرا اہم نکتہ جس کی طرف احقر حاضرین مجلس کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے، وہ ہمارے نظام کو اسلامی خطوط پر استوار کرنا ہے۔

بیسویں صدی سوشلزم کا ظہور، سرمایہ دار اور سوشلسٹ ممالک کے درمیان محاذ آرائی اور آخر میں سوشلزم کے سقوط کا مظاہرہ دیکھ چکی ہے، مغربی سرمایہ دار ممالک سوشلزم کے سقوط کی اس طرح خوشیاں منا رہے ہیں گویا یہ ان کی نہ صرف سیاسی بلکہ ان کے فکر و نظر کی فتح کا حقیقی ثبوت ہے، اسی طرح وہ کمیونسٹ تصورات کے سقوط کو بھی سرمایہ داری نظریہ کی حقانیت کا بیّن ثبوت قرار دے رہے ہیں، اور یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام ہی اب انسانیت کے لئے ایسا واحد نظام

ہے جسے اپنائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سوشلزم یا کمیونزم سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے ظالمانہ اصولوں اور خصوصاً دولت کی غیر مساوی تقسیم کے ردعمل کے طور پر ابھرا تھا جو گذشتہ کئی صدیوں سے سرمایہ دار ممالک میں نظر آ رہی تھی۔ سوشلزم ان برائیوں کی نشاندہی کرنے اور معاشرے پر ان کے برے اثرات کی تنقید کرنے میں حق بجانب تھا۔ سوشلزم کی ناکامی کی وجہ سرمایہ دارانہ نظام پر صحیح تنقید نہ تھی، بلکہ اس کی وجہ خود اس کے پیش کردہ متبادل نظام کے اندر موجود خرابیاں تھیں، لہٰذا سوشلزم کی ناکامی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے اندر کوئی خرابی نہیں رکھتا تھا، بلکہ وہ خرابیاں ابھی تک موجود ہیں، اور ان کی اصلاح بھی نہیں کی گئی ہے، جو ممالک سرمایہ دارانہ نظام کی اتباع کر رہے ہیں وہ ابھی تک دولت کی غیر مساوی تقسیم میں مبتلا ہیں، مالداروں اور غیر مالداروں کے درمیان عظیم فرق اور دولت کے عین درمیان غربت (Poverty in the midst of plenty) ان کے نظام معیشت میں ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، یہی سرمایہ دارانہ نظام کے حقیقی مسائل ہیں، جنہیں اگر صحیح طرح حل نہیں کیا گیا تو یہ ایک اور ردعمل کو جنم لے سکتے ہیں، جو سوشلزم سے کہیں زیادہ سخت اور ظالم ہوگا، سوویت یونین کے سقوط اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ بعض وسط ایشیائی ریاستیں دوبارہ کمیونزم کی طرف رخ کر رہی ہیں، یہ حقیقت اس پارلیمانی انتخابات کے نتائج سے اچھی طرح محسوس کی جا سکتی ہے، جس میں کمیونسٹ پارٹیوں نے اپنی اپنی پارلیمنٹ میں بھاری اکثریت سے سیٹیں حاصل کی ہیں، یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ کمیونزم یا سوشلزم کے پاس واقعتاً کوئی فضیلت یا اچھائی موجود ہے بلکہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے تسلط کے

برے نتائج اور غیر مساویانہ تقسیم دولت کا دوبارہ ردعمل ہے۔

اسی لئے اب دنیا ایک ایسے تیسرے نظام کی شدید محتاج ہے، جو اسے ان دونوں نظامہائے معیشت کی ان خرابیوں سے نجات دلائے، جن سے انسانیت گذشتہ چند صدیوں سے دو چار رہی ہے، اس تیسرے نظام کے لئے مسلم امہ کی طرف سے اسلامی خطوط پر کام کیا جا سکتا ہے، وہ معاشی اصول جو قرآن پاک اور احادیث نبویہ علیہ الصلوۃ و السلام سے ماخوذ ہیں، آج کی دنیا کے تمام معاشی مسائل کو حل کرنے میں مکمل کافی و شافی ہیں، کیونکہ اسلام جہاں ذاتی ملکیت اور بازاری معیشت کی اجازت دیتا ہے، وہاں وہ ایک منصفانہ تقسیم دولت کا ایک سوچا سمجھا نظریہ بھی پیش کرتا ہے، جو معاشی زندگی کی ناہمواریوں سے نجات بھی دلاتا ہے، اور ایک ایسا نظام پیدا کرتا ہے جس میں ذاتی منافع کا محرک (Motive of personal profit) معاشرے کے مجموعی مفاد کے ساتھ شیر و شکر ہو کر چلتا ہے، سوشلزم کی ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ناہمواریوں اور غیر مساویانہ تقسیم سے مایوس لوگوں نے ذاتی ملکیت کے حقیقی تصور اور بازاری قوتوں پر حملہ کر کے ایک ایسے معاشی نظام کا مفروضہ پیش کیا جو بالکل غیر حقیقی، مصنوعی اور جابرانہ تھا، ذاتی ملکیت کی آزادی کے انکار نے پیداواری جذبہ کو نہ صرف ختم کر دیا بلکہ وسیع ریاستی طاقت نے عوام کی قسمت حکمران طبقہ کے ہاتھوں میں دے دی۔

تجربات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نہ ذاتی ملکیت سرمایہ دارانہ نظام کی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کی بنیادی وجہ تھی نہ بازار کی قوتیں، بلکہ سرمایہ دار ممالک میں معاشی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کی بنیادی وجہ ذاتی منافع کے بے لگام استعمال اور جائز اور ناجائز کمائی کے درمیان امتیاز کرنے والے معیار کا فقدان

تھا، جس نے تمام دولت کو چند مالدار لوگوں تک محدود کر دیا، سود، قمار، جوئے اور غیر اخلاقی خواہشات کی تکمیل جیسے طریقوں کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی سرمایہ دارانہ نظام میں اجازت دی گئی، جس نے مارکیٹ میں اجارہ داری (Monopoly) کا رجحان پیدا کر دیا، جس کے نتیجہ میں طلب اور رسد کی طاقتیں یا تو بالکل مفلوج ہو کر رہ گئیں یا ان کے عمل کو اپنے بھرپور اثر سے روک دیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ سرمایہ داری نظریہ ایک طرف تو طلب اور رسد کو سرگرم کرنے کے لئے اصول عدم مداخلت (Laisez fair) کا اعلان کرتا ہے تو دوسری طرف مندرجہ بالا غلط ذرائع کاروبار کی اجازت دے کر ان کے قدرتی عمل میں مداخلت کرتا ہے، سرمایہ دار ایسی اجارہ داریاں (Monopolies) پیدا کر کے اپنے جابرانہ فیصلے عوام الناس کی کثرت پر مسلط کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے بازاری طاقتوں کو ان کا حقیقی کردار ادا کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔ سود کا مستقل رجحان یہ ہے کہ وہ مالدار صنعتکاروں کے مفاد کے لئے کام کرے، کیونکہ یہ صنعتکار ہی اس دولت سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو غریب عوام بنکوں میں اپنی بچتوں کی صورت میں جمع کراتے ہیں اور جب انہیں عظیم فائدہ ہوتا ہے تو وہ عوام الناس کو اس میں شریک کرنے کے بجائے ایک متعین شرح سے سود دیتے ہیں، اور پھر اس سود کو بھی وہ دوبارہ اپنی پیداوار کے اخراجات کی مد میں قیمتوں میں اضافہ کر کے واپس وصول کر لیتے ہیں، مجموعی سطح پر اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مالدار لوگ کھاتہ داروں (Depositors) کی رقموں کو اپنے نفع کے لئے استعمال کرتے ہیں، اور حقیقت میں ان (Depositors) کو کچھ ادا نہیں کرتے، کیونکہ وہ سود جو وہ مالیاتی اداروں کو ادا کرتے ہیں، وہ صارفین جیسے عوام الناس سے ان کی پیداواری قیمت میں اضافہ کر

کے واپس لے لیتے ہیں، اسی طرح جوا ہزاروں لوگوں کی دولت چند ہاتھوں میں مرتکز کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ اور کمائے بغیر دولت کے حصول کی لالچ اور طمع کو بڑھانے کا ایک تباہ کن محرک ہے، سٹہ کے معاملات بھی فطری بازاری عمل کو ڈسٹرب کرنے اور دولت کی غیر مساویانہ تقسیم میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، خلاصہ یہ کہ حلال اور حرام کا امتیاز نہ رکھنے والا نظام معاشرے پر پڑنے والے برے اثرات سے لاپرواہ ہوکر ہر قسم کی تجارتی سرگرمیوں کے لئے کھلا ہوا ہے۔

اسلام نہ صرف بازاری طاقتوں کو قبول کرتا ہے، بلکہ ان کو ایک ایسی میکانیت (Mechamism) مہیا کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اجارہ داریوں کی رکاوٹوں کے بغیر اپنی قدرتی طاقت کے ساتھ عمل جاری رکھتے ہیں، صحت مند پیداوار اور مساویانہ تقسیم کی فضا برقرار رکھنے کے لئے اسلام معاشی سرگرمیوں پر دو قسم کے کنٹرول عائد کرتا ہے۔

پہلی قسم کے کنٹرول سے اسلام نے تجارت اور کمائی کے عمل کو کچھ ایسے مخصوص اور پروقار طریق ہائے کار کے ساتھ متعین کر دیا ہے جو بالکل وضاحت کے ساتھ حلال اور حرام کے درمیان امتیاز کرتے ہیں، یہ طریقے اجارہ داریوں کو روکنے اور غلط اور غیر اخلاقی کمائی اور معاشرے کے اجتماعی مفادات کے خلاف تجارتی سرگرمیوں کو ختم کرنے کا سبب بنتے ہیں، جدید اقتصادی ضروریات کے سیاق میں جہاں عام لوگوں کی بچتیں ترقی کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، اسلامی طریق ہائے تمویل مثلاً سود کے بجائے مشارکہ اور مضاربہ کا استعمال عوام کو ترقی کے پھل میں بلاواسطہ شریک اور حصہ دار بناتے ہیں، جس کی وجہ سے معاشرے میں ایک متوازن طریقے سے خوشحالی آتی ہے، اور امیر وغریب کے درمیان فرق کم سے

کم ہو جاتا ہے۔

دوسرے قسم کا کنٹرول زکوٰۃ وصدقات اور کچھ دوسرے مالیاتی ذمہ داریاں عائد کرنے کے ذریعہ عمل میں لایا گیا، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ حلال آمدنی بھی دوبارہ ایسے لوگوں کو تقسیم کی جائے جو تجارت کے بھرپور مواقع میسر نہ آنے کی وجہ سے اپنی ضروریات کے لئے نہیں کما سکے، خلاصہ یہ کہ دولت کو مستقل گردش اور پھیلاؤ میں رکھنے کے لئے اور دولت کو محدود ومرکوز کرنے کے مواقع ختم کرنے کے لئے غلط اور ناجائز آمدنی کے راستے مسدود کر دیئے گئے، اور زکوٰۃ، صدقات اور وراثت کے ضابطے وضع کئے گئے۔

چونکہ موجودہ صدی میں دنیا سوشلزم کا زوال اور سقوط بھی دیکھ چکی ہے، اور سرمایہ دارانہ نظام کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کے زخم بھی ابھی تک مندمل نہیں کر پائی ہے، لہٰذا اب مسلمانوں کے لئے یہ بہترین موقعہ ہے کہ دنیا کو قرآن و سنت سے مستنبط اصول و احکام کی طرف دعوت دے، جو دو انتہاؤں کے درمیان ایک پرامن اعتدال فراہم کرتے ہیں، لیکن ہمارے لئے ایک پریشان کن مسئلہ یہ بھی ہے کہ اسلامی نظام کے اصول ابھی تک صرف نظریاتی ہیں، جو ابھی تک عملی شکل میں ہمارے سامنے نافذ نہیں، یہاں تک کہ مسلمان ممالک نے بھی ابھی تک اپنی معیشت کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کی سعی نہیں کی ہے، ان میں سے اکثر اب تک سرمایہ دارانہ نظام کی اتباع کر رہے ہیں، اور وہ بھی ایسے ناپختہ اور ادھورے طریقوں پر جن کی وجہ سے ان کی اقتصادی حالت ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے، اور بدقسمتی سے واضح اسلامی اصولوں کی موجودگی کے باوجود مسلمان ممالک میں معاشی ناہمواری اور عدم مساوات مغربی

مما لک کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔

یہ افسوسناک صورت حال ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتی، اگر ہم اپنے راستوں اور طریقہ کار کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دیں گے تو انقلاب اور ردعمل کی جانب فطری عمل اپنے راستے ڈھونڈنے پر مجبور ہو جائے گا، اگر ہم ایسے انقلاب کے تباہ کن اثرات سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے معاشی نظام کو قرآن و سنت سے مستنبط اور ماخوذ واضح معاشی نظام پر ازسرنو استوار کرنا پڑے گا، اگر ہم اسلامی اصولوں کے مطابق کوئی نظام نافذ کرنے کے قابل ہو گئے تو نئی صدی کی آمد کے موقعہ پر یہ ہماری طرف سے انسانی برادری کے لئے ایک بہترین اور عظیم تحفہ ہوگا، مجھے امید ہے کہ اگر ہم اسلامی معیشت کے اصولوں کو اخلاص کے ساتھ ٹھیک نافذ کر دیں تو آج ہم بقیہ دنیا کو بھی پہلے کی بہ نسبت اسے قبول کرنے پر زیادہ آمادہ پائیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح سمجھ عطاء فرمائیں اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین